



حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم





کے دس (10) دن





تصنیف
خالد محمد خالد





ناشر
مکتبہ تعمیرِ انسانیت
اردو بازار ۰ لاہور



عشرۃ ایام فی حیاۃ الرسول

یعنی

حیات رسول کے دس دن

تصنیف:
خالد محمد خالد

ترجمہ:
مقصود عالم صدیقی۔ ایم اے

مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور



نام کتاب: ـــــــ حیاتِ رسولؐ کے دس دن

ناشر: ـــــــ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور

طبع: ـــــــ اوّل

مطبع: ـــــــ میٹرو پرنٹرز، لاہور

قیمت: ـــــــ ۳۰ روپے



عنوانات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

○ ترسٹھ سال کی عمر ——— اس عظیم شخصیت نے اس شان سے گذاری کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اثنائے ولادت سے آخری سانس تک ——— آپؐ کی پوری حیاتِ طیبّہ ایک نہایت حسین سانچے میں ڈھلی ہے، گویا خلّاقِ اعلیٰ نے اس کے اندر باکمال خوبیاں جڑ کر اس کو جگمگا دیا ہے۔ اس طرح زندگی گذارنے والوں کو ہادی و پیشوا مل گیا اور خود حیاتِ انسانی ایک نور پا گئی ......

• جس دن سے آپؐ نے اس کرۂ خاکی پر اپنی زندگی کی شمع روشن کی، ہر آن و ہر لحہ آپؐ نے اپنی ساری توانائیاں اور زندگی کے تمام مظاہر کو ایک انقلاب و تغیّر کی جدّوجہد کے لئے وقف رکھا۔ الغرض ——— درود و سلام ہو آپؐ پر ———

آپؐ ایک عام انسان نہ تھے جو اس دُنیا میں صبح و شام آنے والوں کی طرح آئے ہوں، بلکہ ..... آپؐ ایک "طبیعی قوت" تھے جو زمان و مکاں کی نگہبان بن کر نمودار ہوئی اور انسانو اور حیاتِ انسانی کی از سرِ نو تشکیل کا منصوبہ لئے میدانِ عمل میں اتری تھی !! بلکہ اس سے بھی بلند

تر ..... آپؐ کیا آئے کہ ایک " قوتِ الٰہیہ " ظہور پذیر ہوئی جس کا مدعا یہ تھا کہ رُوحِ انسانی کو اس کے مدارِ اصلی پر لا کر ڈال دے جو خدائے برحق، خالقِ ارض و سما، اور منبعِ نور و ظلمت کے گرد چکّر لگاتے رہنے کا مدار ہے۔ چونکہ مالک الملک نے خود اپنی ذات کے اظہار اور اپنی جانب سے پیغام رسانی کے لئے آپ کو منتخب کر رکھا تھا، اس لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ آپؐ کی حیاتِ پاک اور آپؐ کے لیل و نہار تقویٰ و طہارت اور جلال کی ایک مثالِ باکمال بن کر آئے۔ !!

آپؐ کی یہ حیاتِ پاک شب و روز پڑھی جانے والی ایک کھلی کتاب تھی اور ہمیشہ رہے گی۔

پوری انسانی تاریخ میں، تمام تر طالبانِ حق اور مخلصین و قائدینِ انسانیت سمیت، کوئی ایک شخصیت ایسی نہیں پائی جاتی ہے جس کی زندگی کے حالات و واقعات اس قدر واضح اور اتنی عام تفصیل کے ساتھ محفوظ ہو کر ہم تک منتقل ہوئے ہوں جتنی ربِ کائنات کے پیغامبر اور اس کی جانب سے تمام نوعِ انسانی کے لئے ہدیۂ رحمت [محمدؐ بن عبد اللہ] کی حیاتِ مبارکہ کی محفوظ نقل ہمارے سامنے موجود ہے۔ !!!

آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات ..... آپؐ کے پائے مبارک کی رَوِش کا ہر نقش ..... روئے انور پر کھلتا ہوا ہر تبسم ..... چشمِ ابرو سے ٹپکنے والا ہر آنسو ..... اللہ کی حمد و تکبیر کی صدا لئے باہر آنے والی ہر سانس ..... آپؐ کی ہر راہ جس پر آپؐ نے اپنے مخصوص انداز کے قدم ڈالے ..... آپؐ کے شب و روز کے تمام مشاہدات، یہاں تک کہ وہ معاملات جو آپؐ کی ذات کے لئے مخصوص تھے اور وہ بھی جو اندرونِ خانہ اور اہل و عیال سے تعلق رکھتے تھے ..... ان میں سے

ہر چھوٹی بڑی بات جلی حروف میں ہم تک منتقل ہوئی ہے، وہ بھی اتنے پختہ اور قابلِ وثوق طریقے پر کہ تاریخِ انسانی کو جتنے وسائل اور توضیح و بیان کے جو بھی طریقے میسر اور معلوم ہیں ان سب سے پوری دیانت اور عرق ریزی کے ساتھ کام لیا گیا ہے... !

آپؐ ہماری دنیا سے اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس رحلت فرما گئے، اس کو قریب چودہ سو سال ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود آج جب ہم آپؐ کی سیرت اور تاریخ کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ہم آپؐ کے متعلق کوئی چیز "پڑھ" رہے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ہم بہ نفس نفیس آپؐ کو "دیکھ" رہے ہیں اور خود آپؐ کی زبانِ مبارک سے "سُن" رہے ہیں۔ پھر کانپتی ہوئی مغلوب سانسوں کے ساتھ ہم دم بخود ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ کتابوں میں لکھی ہوئی اور الفاظ کی سطروں کے پیچھے پنہاں جس ذات کے متعلق ہم مطالعہ کر رہے ہیں، وہ بذاتِ خود ہمارے سامنے موجود ہے .... !

یہ بھی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ ازل سے ہی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس غرض سے منتخب کر کے رکھا تھا کہ آپؐ ہی پر نبوت اور انبیار کا سلسلہ ختم کرنا ہے۔ ایسی صورت میں آپؐ کی حیاتِ مبارکہ بے شمار جیالوں کے لئے ایک شاہراہ اور سند ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ضروری تھا کہ یہ تمام تفصیلات کے ساتھ، صبح کی سفیدی اور دن کی روشنی سے زیادہ واضح اور تابندہ ہو ! نہ صرف اپنے زمانہ کے لئے بلکہ تمام زمانوں اور تمام جیالے جوانوں کے لئے تاکہ وہ اِس حیاتِ مبارکہ سے روشنی اور ہدایت پائیں .. !!

یہی وہ چمکتی دمکتی اور بھرپور حیات طیبہ ہے جس سے خوشہ چینی کر کے اِس کتاب کے صفحات کو زینت بخشی گئی ہے تاکہ کم از کم چند ایام ہی سہی، اس حیات طیبہ کے قریب ہم ٹھیر لیں، اس کی صحبت سے بہرور ہو لیں اور اس کے نورانی دائرے میں کچھ مبارک اوقات

گذار لیں تاکہ اس کے رموز اور بخششوں کے کچھ چھینٹے ہمارے حصے میں بھی آ سکیں۔

ہاں .... تو آپؐ کی عظیم اور پاکیزہ زندگی کے ایام میں سے، جو تمام کی تمام یکسوئی اور جدّ و جہد میں ..... اور بلندی و بزرگی میں .... ہم رنگ و یکساں ہیں، ہم یہ دس ایام منتخب کرتے ہیں یہاں ہم ان ایام سے چھلکتے ہوئے مشاہدات کے درمیان نظروں کو مرتکز کر کے اس زبردست فوقیت کی خصوصیات پر غور کریں گے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی شخصیت کو ابھرنے کا موقع دیا۔ نہایت بابرکت درود اور پاکیزہ سلام ہو آپؐ پر اور آپؐ کے آل و اصحاب پر۔

جب ہم ان ایام کو خصوصی طور پر منتخب کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے بعض گوشوں کو بقیہ دوسرے گوشوں پر فوقیت و فضیلت دیتے ہیں۔ نہیں! بلکہ آپؐ کی زندگی تو پوری کی پوری، اپنے تمام اور لمحات سمیت جدّ و جہد، بلندی اور اللہ کی نعمت و کمال کے اظہار کے اعتبار سے یکرنگ و یکساں تھی ..... ان ایام کے انتخاب سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ اس بلند و بالا، وسیع و عمیق اور عظمت و تقدس سے مالا مال قصرِ حیات میں داخل ہونے کا ہم نے ایک کشادہ دروازہ پالیا ہے ـــــ ایک ایسا دروازہ جس میں داخل ہو کر ہم اس حیاتِ پاک کے بہت سے روشن و ضیاء پاش اسرار تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔ اور اس کی برتر خصوصیات، دلکش عادات و خصائل اور کبھی کم نہ ہونے والی بخشش کے پاس رہ کر فیضیاب ہو سکیں گے !!!

اور بدیہی طور پر یہاں دن سے ہماری مراد چوبیس گھنٹوں پر مشتمل اوقات کی اکائی نہیں ہے، اگرچہ ہم نے جن ایام کا انتخاب کیا ہے ان میں زیادہ تر وہی اکائیاں ہیں ..... مگر یہاں دن سے ہماری مراد ـــــ نسبت یا واقعہ کے اعتبار سے وہ تاریخی موقع

و محل جو ہمارے ہوش گوش کو تیز کر دیتا ہے۔ خواہ یہ موقع و محل ایک دن کی صورت میں واقع ہو یا چند ایام پر مشتمل ہو۔ اس انتخاب میں زمانی پیمانہ وہ دن ہے جس کے جلیل القدر احوال و واقعات کا داخلی مطالعہ کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں گے جبکہ اس کا اندرون شان ایثار عظمتِ حوصلہ اور استقامتِ راہ کے لحاظ سے انسانی فہم کے لئے حیران کن ہے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ــــــ ہم عاجزی اور رشک کے ساتھ اس حیاتِ پاک سے قریب ہونے کی کوشش کریں گے ....

ایسے لوگوں کی عاجزی جو آپؐ کے ساتھ نسبت اور لگاؤ سے ابھرنے والے جلال کو اور آپؐ کے دیدار سے پیدا ہونے والی ہیبت اور حیا کو پا لیتے ہیں۔

اور ایسے لوگوں کا رشک جو اس مالِ غنیمت کی امید میں بیٹھے ہوں جو اس دیدار سے رُوح کو وافر طور پر حاصل ہوتی ہے۔

خالد محمد خالد

یومِ تحکیم

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ

اور اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا بلکہ جب کہ تم ان کے درمیان موجود تھے۔

(سورۃ انفال : ۳۳)

○ یہ دن "رسالت سے پانچ سال قبل کا دن ہے۔"ٰ

اگرچہ اس کتاب کے موضوع کیلئے جن ایام کو ہم نے منتخب کیا ہے، وہ ابتدائے وحی کے بعد آنے والے ایام ہیں اور نبوت و رسالت کے دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس انفرادیت کے پیشِ نظر ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ اپنے مقرّر کردہ نشانہ سے تجاوز کریں۔!!

جن دس ایّام کو ہم نے لیا ہے۔ ان میں یہ واحد دن ہے جس کو ہم نے قبلِ وحی کے ایام سے منتخب کیا ہے۔ اس کا تعلق دراصل اس دَور سے ہے جو بارِ نبوت کو اٹھانے کی تیاری و ہمواری کا دَور تھا۔ اور ہم نے جس قسم کا موضوع اٹھایا ہے، اسکی تکمیل ممکن نہ تھی جب تک ہم تیاری و ہمواری کے دَور سے بھی چند ساعات بطور نمونہ "مشتے از خروارے" پیش نہ کرتے جو وحی کی ندا آنے اور نبیؐ منتخب کئے جانے سے قبل ایک ایسا عظیم الشان دَور تھا جس پر خود حیاتِ نبویؐ کو ناز ہے۔

ظاہر ہے کہ ہماری اس بحث کے میدان میں اتنی تنگی بھی نہیں ہے کہ ان چند ساعات کی ضیا رپاشیوں سے فیضیاب ہونے کے لئے تھوڑی دُور چل لینے میں ہمارے لئے کوئی رکاوٹ ہو۔ اس لئے ہم نے اس دن کو منتخب کر لیا ہے جو قبل وحی کے ایّام کی تمام خصوصیات، امتیازات اور بنیادوں کی سچی اور بہترین تصویر پیش کرتا ہے۔

وہ ــــ ایک ایسا دِن تھا کہ اس کی نبض مضبوط تھی، رُخ واضح اور روشن تھا اور اشارات کمال درجے کے حامل تھے ....!!

وہ دن .... جہاں حیاتِ نبویؐ کے دَورِ ماضی کی انتہائی چوٹی پر پہاڑوں کی سی بلندی اور موتیوں کی سی آب و تاب کے ساتھ چلتا نظر آتا ہے، وہیں آنے والے دَور پر بھی اثر انداز رہا

ٰ یعنی جب آپ ۳۵ سال کے تھے اور غیبی اسرار کا ظہور خوابوں کی شکل میں ہونے لگا تھا۔ (مترجم)

ہے۔ چنانچہ اس کی زبان سے ہم اس آیت کریمہ کی تفسیر واضح طور پر سنتے ہیں :

"اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (سورہ انعام : ۱۲۴)
اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغام بری کا کام کس سے اور کس طرح لے :

ہاں ! یہ دن تبلا دیگا، بلکہ اس کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹہ ہی اچھی طرح روشن کر دے گا کہ وحی و رسالت کے قبل کے چالیس سال نے اپنے دامن میں امانت، طہارت، عظمت اور استقامت کا کتنا زبردست ذخیرہ سمیٹ رکھا تھا، اسی طرح اس کے لمحات انسانی قرار و پناہ کی زبردست بنیادوں کا اظہار پرکشش انداز میں کریں گے۔ پھر اس منبع فوز و فلاح کو حقیقی اشاروں کی شکل میں اس شخص کی طرف منسوب کیا جائے گا جو آنیوالے ایام کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے تمام دنیا والوں کے سامنے آئیگا، جو نبوت و رحمت اور مضبوط دلیل و حجت بن کر کھڑا ہوگا ....!!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یوم تحکیم سے متعلق ہماری گفتگو کا آغاز اس کے تاریخی پہلو سے ہو۔ اسلام کے ظہور سے پانچ سال قبل جبکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی تھی، ابھی وحی آنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، آپؐ کی روح حق کی تلاش میں چل کر غذا حاصل کر رہی تھی ــــــ کہ قریش کے لوگوں کے درمیان تعمیر کعبہ کے مسئلہ پر اتفاق رائے ہو گیا کعبہ ان کی وہ مقدس ترین شے تھی جس کے وہ وارث تھے۔ اس زمانہ میں یہ سیسہ پلائے ہوئے بڑے بڑے پتھروں سے بنا تھا، اس پر کوئی لیپ نہ تھا جو اس کے اندر مضبوطی اور حسن پیدا کرتا یہاں تک کہ چھت بھی اٹھائی ہوئی نہ تھی۔

اب اہلِ قریش چاہتے تھے کہ اس کو بنیاد سے از سرِ نو اٹھایا جائے اور اس پر ایک ایسی

عمارت بنے جو، ان سرداروں کے شایانِ شان ہو۔ لوگوں کے درمیان باہم فیصلہ ہوا کہ اس میں اپنی کھری کمائی کا پاک پیسہ لگایا جائیگا۔ چنانچہ ابووہب بن عائذ بن مخزوم اٹھا۔ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا خالو تھا۔ کہنے لگا:

"اے گروہِ قریش!

تم اپنی کمائی میں سے پاک مال کے علاوہ کچھ بھی اس میں نہ لگاؤ۔

اس کے اندر ناجائز مہر کا پیسہ، سود کا پیسہ اور ظلم کے ذریعے حاصل کیا ہوا پیسہ ہرگز نہ لگے گا۔"

اہلِ قریش کام میں لگ گئے۔ ضرورت کے پتھر اور لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ شرف قربت اور حصولِ ثواب کی غرض سے تمام قبائل نے آپس میں کام تقسیم کر لیا تاکہ ہر پہلو سے تمام قبیلے زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکیں۔

لوگ عمارت بناتے چلے گئے، یہاں تک کہ دیوار رکن کی جگہ تک آ گئی جہاں "حجر اسود" کو رکھا جانا تھا۔ یہ وہی حجر اسود ہے کہ اللہ کے دین کی راہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام جو مشقتیں اٹھائیں، ان میں پنہاں ہیبت و جلال کے رمز کا شریک رمز ہے۔

سوال یہ تھا کہ ــــــ قبیلوں اور عام انسانوں میں سے وہ کون خوش نصیب ہو جو حجر اسود کو اٹھا کر اس کی اصل جگہ پر نصب کرنے کا شرف حاصل کرے۔ کوئی قبیلہ اس پر راضی نہ تھا کہ اس شرف کو اپنے سوا کسی دوسرے قبیلے میں جانے دے۔ چنانچہ وہ سب تُلے بیٹھے تھے کہ اگر حالات کا تقاضا ہوا تو تلواریں بھی بے نیام ہو سکتی ہیں اور جانیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ ان کے مابین حجت و مخالفت طول پکڑ گئی، جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا غیظ و غضب جوش مارنے لگا۔ قومی جنگ کا بگل

بھی بجنے لگا، ہر طرف آوازیں گونجنے لگیں۔ یہاں تک کہ بنو عبد الدار کے لوگ خون سے بھرا ایک پیالہ لائے۔ ان کے ساتھ بنی عدی کے لوگوں نے بھی اپنے ہاتھ اس پیالے کے اندر ڈبو کر عہد کیا اس عظیم شرف اور شاندار ذریعۂ تقرب کو اپنے ہاتھوں سے نہ جانے دیں گے، خواہ اس راہ میں جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔

اہلِ قریش نے بھیانک تباہی کی اس کشمکش میں پانچ دن گذار دیئے..... آخر چھٹے دن جب مسجدِ حرام میں لوگ نظریں گڑائے، پنجے اور زانو کے بل فیصلے کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے، تو ان میں سے ایک شیخ نے ایک حل کی طرف اشارہ کیا، ان کی تجویز تھی کہ اپنے نزاعی معاملے کے فیصلے کا اختیار اس شخص کو سونپ دو جو اگلے دن مسجد میں سب سے پہلے داخل ہو۔ تمام لوگ اس مشورہ کو سن کر پھڑک اٹھے اور سب نے اس کی توثیق کر دی۔

دوسرے دن لوگ ٹولیوں میں حلقے بنا بنا کر بیٹھ گئے۔ اضطراب میں ڈوبے ہوئے..... نظریں دروازہ پر پوری توجہ کے ساتھ ٹکی ہوئی..... !!

تمہارے خیال میں قدرت کی جانب سے وہ کون خوش نصیب ہو گا جس کے ہاتھوں شیرازہ بندی کا یہ کام انجام پائے گا اور جو اس شگاف کو پاٹ کر ایک مضبوط و مستحکم راستہ نکالے گا۔ ؟؟

اچانک روشن ہو گیا، زندگی کے بہت سے لمحات میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ تہلیل و مسرت سے جھومتی فضا میں، جبکہ ابھی قوم کے تمام لوگ دیکھ بھی نہیں پائے تھے، ان کی آوازیں یکلخت بلند ہوئیں، ایسا لگا کہ پہلے ہی سے وہ ٹھیک اسی وقت کے منتظر تھے، پکار اٹھے:

["ارے! یہ تو وہی امانت دار شخص، ہم اس سے راضی ہیں، وہ دیکھو، وہ محمدؐ ہیں"]

محمد ـــــ عَلَیۡہِ اَفضَلُ الصَّلوٰۃ وَ اُزکیٰ السّلام ـــــــ آگے بڑھتے ہیں۔ بڑھ کر یہ خبر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آج پہلے آنیوالا شخص کون ہے؟ اور جب آپؐ پر واضح ہو گیا کہ وہ پہلے شخص آپؐ خود ہیں، تو آپؐ کا سر اپنے رب کی شکر گذاری میں جھک گیا، مالک! تو نے مجھے ہی منتخب فرمایا، اور اس عظیم مہم کا شرف عنایت فرمایا.... آپؐ نے یہ بحث چھیڑی ہی نہیں کہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ آپؐ پر الہام ہوا،..... آپ کا یہ معاملہ بالکل عیاں تھا کہ جہاں دوسروں کی نظریں راستہ دیکھنے میں اندھی ثابت ہوتیں، وہاں آپ مضبوط اور مصمم عملی سعی کے لئے کمربستہ رہتے تھے۔ آپ نے اپنا ہاتھ لوگوں کی طرف یہ فرماتے ہوئے بڑھایا کہ :

لاؤ، مجھے ایک کپڑا دو"

لوگوں نے جلدی سے ایک کپڑا دیا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ نے کپڑا پھیلا دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اس پتھر کو اٹھا کر اس کے بیچ میں رکھ دیا۔ اور پنجے کے بل دوزانو تیار بیٹھے تمام لوگوں کو آواز دی کہ چلو ہر قبیلہ والے کپڑے کا ایک ایک گوشہ تھام لو! پھر آپؐ نے ایک ساتھ سب کو اوپر اٹھانے کا حکم فرمایا جب اٹھا کر پتھر کو جگہ کے سامنے لے آئے تو آپؐ نے اپنا دستِ مبارک لگایا اور اس کو صحیح مقام پر نصب فرما دیا پھر آگے تعمیر کے کام میں اہلِ قریش جُٹ گئے۔

یہ دن ..... دراصل تاسیس کا عظیم دن تھا۔ یہ وہ دن تھا جب آسمان نے ..... شاید پہلی بار اپنے اس پسندیدہ و منتخب بندے کو وسیع و کشادہ روشنی کے دائرے میں داخل کرنا شروع کیا۔ اور آپ کو درپردہ اس دَور کی طرف بڑھانا شروع کر دیا جس کا انتظار تھا جس میں آپؐ کل ـــــ قریب ہی کسی دن ـــــ اعلانیہ قدم بڑھانے والے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ آپؐ کی سابقہ زندگی کے لمحات آنے والے دَور کے لئے رواں دواں اشاروں سے بھرے پڑے تھے۔

جس دن آپؐ عالمِ وجود میں تشریف لائے، اسی دن سے آپؐ کے احوال و معاملات اور آپؐ کے دَور کی بنیادیں اس طرح مشاہدہ میں آنے لگیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کیسا عجیب و غریب معاملہ تھا کہ جب آپؐ بنی سعد کے دیار میں اپنی دودھ پلانے والی ماں "حلیمہ" کے ساتھ تھے، جبکہ ابھی آپؐ بچے تھے، اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ رہتے ہوئے کھیل کود سے دُور رہتے اور فرماتے :

"میں اس کام کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں۔"

پھر جب آپؐ شباب کو پہونچے تو وہ بھی ایک وقت تھا۔ قریش کے تمام لوگ آپؐ کی تعریف "امین" کے لقب سے کرتے، آپؐ کا اعزاز و احترام کرتے ہوئے آپؐ کو وہ مقام دیتے جو، ان کے ہاں کسی کو نصیب نہ تھا، پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب "بحیرہ راہبؒ" آپؐ کی شخصیت کی تہوں میں پنہاں نبوّت کے تصورات کے سامنے کھڑا مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں سے ابوطالب کو ہلا ہلا کر زوردار الفاظ میں گوش گذار کر رہا تھا۔ :

"اپنے اس بھتیجے کو لیکر اپنے وطن لوٹ جاؤ۔ دیکھو! یہود کی نظروں سے اس کو بچائے رکھنا، کیوں کہ اگر انھوں نے دیکھ لیا اور جو بات میں نے پہچانی ہے، اگر وہ بھی پہچان

پس تو خدا کی قسم ! اس کے ساتھ شر پر اتر آئیں گے ... تمہارے

اس بھتیجے کے ساتھ ایک بڑا معاملہ ہونے والا ہے"

آپؐ کی اپنی پاکیزہ فطرت اور تیز بصیرت نے فہم کی راہ پائی اور آپؐ اپنی قوم کو بت پرستی کی گمراہیوں میں دیکھ کر نہایت ملول خاطر رہنے لگے، یہاں تک کہ کنارہ کشی اختیار کرلی۔ آپؐ کی بلند پیشانی بتوں اور مورتیوں کے آگے نہیں جھکی۔ آپؐ دینِ ابراہیمیؑ کی تلاش میں رہے۔ اور اللہ رب العالمین سے برابر رشد و ہدایت اور مدد طلب کرتے رہے۔

ہمارے خیال میں، یوں تو آپؐ کی پوری زندگی ـــــ نبوت سے، اور خود یوم تحکیم سے قبل کی زندگی ـــــ نہایت واضح اور سچی بنیادوں کی حامل رہی ہے، ..... لیکن یومِ تحکیم کو ان تمام بقیہ ایام کے مقابلے میں نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ چنانچہ اس دن جو بنیاد تیار ہوئی، وہ آگے نجات دہندہ دَور میں جاکر اپنی مکمّل شکل میں رونما ہونے والی تھی .....

ہاں ! اور دورِ رسالت میں ـــــ جو درحقیقت دورِ نجات ہے ـــــ جو آپؐ کے ہاتھوں دنیا کو بھیانک تاریکی سے پاک وصاف کردینے والا دَور ہوگا، اس میں رسولؐ کو جو منصبِ قیادت حاصل ہوگا وہ ہرگز لوگوں کے انتخاب کے نتیجہ میں نہیں ہوگا، بلکہ دراصل آسمانی انتخاب آپؐ کو منصبِ قیادت سرفراز کرے گا۔

اسی وجہ سے، جہاں تک "نجات دہندہ" ہونے کی بات ہے تو یہی وہ شخص ہے جس نے اللہ کے نور سے پائی ہوئی اپنی بصیرت کے ذریعے ایک غضب کے نزاع کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی جبکہ یہ نزاع جلد ہی جاہلیت کی ایک "قومی جنگ"..... کی صورت اختیار کرنے والا تھا اور قبائلی لڑائی چھڑ جانے کے امکانات روشن ہوچکے تھے۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو جہاں تک رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا تعلق ہے..... یومِ تحکیم میں آپؐ اپنے ساتھ انسانوں کو نہیں لائے بلکہ شرافت کی ایک عظیم قدر آپؐ کے ساتھ آئی کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قریش کے قبائل سب سے پہلے آنے والے شخص کو فیصلہ کا اختیار سپرد کر دینے پر متفق ہوئے؟ ـــــ آخر وہ کون تھا جو اس پہلے آنے والے شخص کو منتخب کر کے لایا تھا؟ کیا وہ قریش کے لوگ تھے؟ ـــــ ہرگز نہیں، اور نہ کوئی دوسرا انسان تھا ـــــ بلکہ آپؐ کو تو قدرت کی طرف سے ہی چن کر بھیجا گیا تھا!! .... اور پھر وہ شخص "محمدؐ امین" ہی نکلے جو قدرت کی نگاہِ انتخاب میں آئے تھے.... یہ واقعہ جو "تحکیم" کے دن پیش آیا.... اس نے اس "شخص" کے مستقبل قریب کیلئے ایک مضبوط بنیاد رکھ دی.... جب سب سے بڑی قوت، انسانی قوت سے بڑی قوت اس شخص کو نہایت عظیم الشان اور جلیل القدر مہمات کے لئے منتخب کرنے والی تھی جس طرح اس نے آج تحکیم کی مہم کو انجام دینے کے لئے اس کو منتخب کیا۔

یہی دراصل یومِ تحکیم کا زندہ اور پُر مغز اشارہ تھا۔ تا ابد قائم رہنے والے دن کی طرح حیاتِ رسولؐ میں اس کی بیش بہا قیمت ہے۔

یہ مدلل اشارہ اور شاندار قدر و قیمت اتنے مفہوم پر بس نہیں ہو جاتی ہے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے، بلکہ اس کا سلسلہ اُس اسلوب تک دراز ہے جس سے کام لے کر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صورتِ حال کا حل نکالا۔ چنانچہ یہ اسلوب اس طریق کار کی آخری واضح بنیاد ہے جو زندگی کی گاڑی لے چلنے کے لئے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اختیار کرنے والے تھے۔

وہ شخص جس نے تحکیم کے دن اہلِ قریش کو ایک حیرانی سے نکالا، اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے کہ کل وہ رب العالمین کا پیغامبر بن کر ساری دنیا کو حیرانی و ضلالت سے نکالے گا۔

اور جس طریقہ پر آپ نے اہلِ قریش کی حیرانی کو آج دُور کر کے ان کی گتھی کو سلجھا دیا، اس سے دراصل بنیادی طور پر اس طریقۂ کار اور اس راہ کی وضاحت ہوتی ہے جس کو وہ کل اختیار کرنے والے تھے تاکہ دنیا کی حیرانی اور تاریکی چھٹ جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس راہ کی اصل حقیقت کیا تھی؟ اسی سے اس طریقۂ کار کے جوہر کو بھی ہم دیکھ پائیں گے..... وہ اصل حقیقت ہے "توفیق اور میل ملاپ"۔

ہاں! تحکیم کے دن نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اسلوب "توفیقی اسلوب" تھا جس کے ذریعہ آپؐ نے باہم جدا ہونیوالے چہروں اور نظروں کے درمیان ممتاز طور پر موافقت و یگانگی پیدا کر دی، اور نفرت و اختلاف کی جگہ پر باہمی تعاون و اتحاد کو لا کر نصب کر دیا جس کے اندر سے خیر کے چشمے نہایت قریبی راستے سے پھوٹ کر بہنے لگے۔

اور یہی طریقۂ کار اس وقت بھی ہوگا جب آپؐ پر جلد ہی وحی کا سلسلہ شروع ہوگا اور آپؐ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہونچائیں گے اس طریقۂ کار کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ "توفیقی" انداز کا ہوگا اور توسط و اعتدال کے مقصد سے اس کی مناسبت ہوگی.... ساتھ ہی جو لوگ اپنے حق کے پیرو ہونے کی دلیل لئے مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں، ان پر بھی یہ واضح ہو جائیگا کہ ان سب کے درمیان وہ مشترک اقدار (VALUE) کیا ہیں جن پر وہ جمع ہو سکتے ہیں اور جن کے ذریعے وہ حق کے دروازہ تک پہونچ سکتے ہیں۔

خود قرآن اس طریقِ کار کو "توفیقی" ہی قرار دے رہا ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	اور اس طرح ہم نے تم کو
وَّسَطًا (بقرہ آیت ۱۴۳)	درمیانی و معتدل امت بنایا۔

اور یہی طریقہ کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ حق کو روشن و مستحکم کرنے کے کام کے دوران ہمیشہ آپؐ کا طریقہ "اعتدال" کا طریقہ تھا، نہ کہ بے اعتدالی کا۔

"جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو معاملوں کے درمیان انتخاب کا موقع دیا گیا تو آپؐ نے ان دونوں میں سے سہل تر، کا انتخاب فرمایا، اِلّا یہ کہ وہ گناہ کا معاملہ ہو۔"

آگے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توفیقی عمل کا مطالعہ کریں گے جو وضاحت اور قوت کے ساتھ اکٹھا ہمارے سامنے آئیگا۔ یہ توفیقی عمل اس وقت تک نظر آئیگا جب آپؐ نے آسمانی مذاہب والے لوگوں کے سورماؤں کے دلوں کو پگھلا دینے والی جدوجہد کی۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب حق کے گرد اکٹھا ہو گئے۔

قرآن کریم اس توفیقی طریقہ کار کو پاکیزہ قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ عین مناسب وقت پر اسکے صحیح مفہوم کو وہ واضح کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکار کر کہتا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا	اے محمدؐ کہدو! کہ اے اہلِ کتاب
إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا	آؤ ایک ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے
وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ	اور تمہارے درمیان مشترک ہے،
وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ	کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن	کریں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک
دُونِ اللَّهِ (آل عمران ۶۴)	نہ کریں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو

یہ اہلِ کتاب کو "مشترک کلمہ" کی طرف دعوت دینا توفیق و ہم آہنگی کا ایک زبردست

وسیلہ تھا، خاص کر ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ کو راہ دی اور ٹولیوں میں بٹ گئے......

یہ "مشترک کلمہ" درحقیقت دین کے اصلی جوہر سے جڑا تھا وہ جوہر ہے ایک اللہ کی بندگی کا جوہر اس کے ساتھ شریک کرنے کے تمام مظاہر سے بے تعلق ہو جانے کا جوہر..... اس جوہر کے ساتھ اس کا جڑا ہونا ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے طریقۂ کار میں "توفیقی" صفت کارفرما تھی۔

یہاں پاکیزہ صفت بن کر پیش آنے کا طریقۂ کار نہ تھا۔ اور نہ یہاں نفع رسانی کے ذریعے اپنی جانب کھینچنے کا طریقۂ کار تھا۔ بلکہ یہاں تو ایک ایسا طریقۂ کار تھا کہ محض خدمتِ حق کی خاطر ساری جدوجہد عمل میں آئی تھی۔ اور محض اس غرض سے چل رہی تھی کہ زمام کار حق کے ہاتھوں میں آجائے۔

اس کا مقصد حق کے گرد جمع کرنے کا تھا، نہ کہ حق کے خلاف اکٹھا کرنے کا۔ خاص کر جب کہ اس پر دسترس ——— ایک ایسے شخص کو حاصل تھا جو ایک لڑی میں پرونے اور بھائی بھائی بنا دینے کے فن کا استادِ کامل تھا ،، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ تھا۔ اور سچ ہے کہ اب تک اس شخص کے جو عظیم آثار سامنے آئے تھے وہ کامیابی کے تمام تر تصورات اور ترقی کے تمام تر خوابوں سے پرے تھے۔

عبداللہ کے بیٹے عَلَیْہِ اَفْضَلُ الصَّلٰوۃِ وَالسَّلَام اس عظیم فن کے استاذ تھے۔ وہ اس طرح کہ آپؐ اپنی پاکیزہ طبیعت اور دلوں میں الفت پیدا کر دینے والی خوبی کی عملی تفسیر تھے۔ آپؐ کے ہمعصر اور ساتھ رہنے والے لوگوں نے آپؐ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ:

"اُن کے ہاتھ سخاوت میں سب سے آگے تھے، ان کا دل بہادری میں بے مثال تھا، ان کا گفتار صداقت سے بھرپور تھا، برتاؤ میں مزاج سب

زیادہ نرم تھا اور قرابت داروں کے لئے وہ سب سے بڑھ کر شریف
اور مہربان تھے"۔

"جو آپؐ کے ظاہر کو دیکھتا مرعوب ہو جاتا، اور جو آپؐ کو پہچان کر آپؐ سے گھُل مل جاتا وہ آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا۔ آپ کے کسی مدح خواں نے آپؐ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے اس جیسا انسان اس سے قبل کبھی دیکھا، نہ بعد میں دیکھنا نصیب ہوا"!!

برتاؤ میں ان کا مزاج سب سے زیادہ نرم تھا اور قرابت داروں کے لئے وہ سب سے بڑھ کر شریف اور مہربان تھے"۔ جس شخص کا حال یہ تھا اسی شخص کا یہ عالم بھی تھا کہ اس کے ظاہر سے لوگ مرعوب ہو جاتے لیکن جب اس سے لوگ گھُل مل جاتے تو اس سے محبت کے چشمے پھوٹ نکلتے ..... یہ وہی شخص ہے کہ اس نے کبھی کسی سے اپنی ذات کے لئے بدلہ نہیں لیا۔

کیا یہ صفات اتحاد و اتفاق اور اخوت و محبت کے داعی کے سوا اور کسی کے اندر ہو سکتی ہیں ...... ؟!

تحکیم کے دن دیکھنے میں آتا ہے کہ قبائل قریش کے اندر کیسے کیسے ردِ عمل رونما ہو رہے تھے جب وہ اپنی نظروں کے سامنے قدرت کو دیکھ رہے تھے کہ وہ امانت دار محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ان کے سامنے اور ان کے اوپر ہر سمت میں اس موقع کی نمایاں شخصیت کی حیثیت دے کر پیش کر رہی تھی ...... کہ یہ شخص بھڑکنے والے نزاع کو منٹوں میں سرد کر کے رکھ دے گا۔ وہ بھی اس انداز میں کہ سہولت حکمت اور ذہانت کی انتہا کر دے گا ..... ؟!

کسی کی کامیابی سے عام طور پر خود پسند نفوس کے اندر حسد کی بھٹی سلگنے لگتی ہے ... پھر

آج کے دن سے بڑھ کر اس کا اور کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ تفاخر، شان اور بڑائی کے مزاج پر قائم قبائلی دنیا میں جنگلی حیوانوں جیسا حسد کس قدر مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔!

لیکن ——— یومِ تحکیم کے عجائبات میں ایک اور عجیب بات یہ تھی جو سامنے آئی کہ...

وہی قبائلی لوگ جو حسد کے جذبات سے بے قابو ہو کر کانپنے لگتے تھے، آج مقابلے کا جذبہ کس قدر سرد سرد پڑ گیا! حقیقت یہ تھی کہ آج وہ بھی اپنی کامیابی اسی بات میں سمجھ رہے تھے جس کو محمدؐ امین نے ان کی کامیابی، بڑائی اور فخر کی چیز سمجھا تھا۔ چنانچہ اس تحکیم کے دن سے لیکر ابتدائے وحی تک کہ جب اس امین شخص کو رسالت کے لئے منتخب کیا گیا، اس پانچ سال کی مدت میں اس صَاحبِ امانت کی قدر و منزلت طور طریقہ کے پہلو سے، بلندی و برتری کے نقطۂ نظر سے اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے قوم کے درمیان بڑھتی ہی چلی گئی۔

یہ جو چھا جانے والی کیفیت صاف نظر آ رہی تھی، وہاں گویا سارا معاملہ ہی فطرتِ اشیأ کے خلاف ہو رہا تھا۔ آخر اس کا راز کیا تھا....؟!

کیسی حیرت کا مقام ہے کہ آپؐ نے چالیس سال کا عرصہ کس طرح ایک ایسی قوم کے درمیان گذار دیا جس کے ہاں بغض و حسد کی چنگاریاں ہمیشہ ہی بھڑکا کرتی تھیں۔ مگر آپؐ کی جلیل القدر شخصیت کو حسد و عناد کا نشانہ بنانے کے بجائے تعریفی کلمات اور قدر و منزلت سے نوازا جاتا رہا۔

اہلِ قریش آپؐ کو دیکھ چکے تھے کہ آپؐ ان کے بتوں کی پوجا کی مذمت فرماتے اور ان کی عبادت و توقیر کے کسی کام میں کبھی شریک نہیں ہوئے ——— پھر ایسا کس طرح ہوا۔؟

ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ قریش کو عین حقیقت کے سامنے لا کر بٹھا دیا تھا تاکہ وہ اس شخص کو خود اپنی نظروں سے دیکھ لیں اور وہ بطور حجت ان کے سامنے آجائے۔ کیوں کہ جب وہی

شخص رسول بن کر ان کو اللہ واحد و قہار کی بندگی کی طرف دعوت دے گا اور جس بت پرستی، جاہلیت اور گمراہی میں وہ غرق تھے اس کو چھوڑنے کی تلقین کرے گا تو یہ لوگ اس کی طرف سے رُخ موڑ لینگے...!!

اہلِ قریش اتہام بازی کے اوچھے پن پر اتر آئے، اور عملاً چنگاریاں برساتے رہے، جب وہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور آپؐ کی رسالت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے.......

مگر محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان کے درمیان چالیس سال تک جس طرح زندگی گذاری تھی ہر آنیوالا دن ان کی عظمت اور ان کے کمال و اوصاف کو اجاگر ہی کرتا رہا..... لوگ آپ کی عظمت کا انکار کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ جب وہ آپؐ کیلئے اس محبت و احترام کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے جس کو انھوں نے چالیس سال تک آپؐ کے لئے روا رکھا تھا..... تو اس عنقریب ہی پیش آنے والے دن —— تحکیم کے دن —— آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جبکہ قبائل قریش مسجد حرام میں خون کے پیالے میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر جنگ کا فیصلہ کر رہے تھے کہ اچانک ان کے سامنے "محمد امین" (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) نمودار ہو جاتے ہیں تو جیسے کسی ڈوبنے والے کو بچانے والا مل جائے، اسی طرح وہ چیخ اٹھے:

"یہ امانت دار شخص، ان سے ہم راضی ہیں"...... !!!

آج وہ آپؐ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر وہ حیرت میں پڑ گئے اور باہم سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو، ان میں صحیح فکر کے لوگ تھے وہ تاڑ گئے کہ آج کے دن دراصل وحیِ عظیم کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ اور بس یہیں سے ان کا ذہن نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی تصدیق کرنے اور آپؐ پر ایمان لانے کے لئے ہموار ہونے لگا۔

اس کے برخلاف جو لوگ کج فکر تھے ان کو بھی بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

زندگی میں عیب جوئی کی عادت نے آج ان کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ وہ ہر اشارہ کو چیلنج کرتے رہے تھے۔ چنانچہ ان کے ہارے ہوئے بے بس مزاج کو اس کے سوا کوئی بات نہ سوجھی کہ وہ یہ مضحکہ خیز بات اڑائیں کہ :۔

"وہ آسیب زدہ ہو گیا" .... !!!

لیکن حق کے دھارے نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس تکلیف دہ چبھن کو خود ان کی طرف پھیر دیا..... ان کی چالیں خود اُن پر اُلٹ دیں.....

اب اس کے بعد وحی آگے بڑھتی ہے، ان کی بچھائی ہوئی سیڑھیوں پر سے پردہ ہٹا دیتی ہے اور ان کے باطل کا صفایا کر دیتی ہے۔ اب ان کی ایک بولی بھی نہیں چلتی ہے، اِدھر زبان کھلی اُدھر وحی نے مدلل اور مسکت جواب دے دیا۔ !!

اب آیئے ! ہم ایامِ وحی کے اوّل دن پر نظر ڈالیں، کیوں کہ یہ ایک حیرت زدہ کرنے والا اور ولولہ انگیز دن ہے ..... !!!

یومِ وحی

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

پڑھو ، اور تمہارا رب بڑا

کرم والا ہے۔

(سورۃ علق : ۳)

یہ مکّہ کی وادی ہے۔ خوشیوں میں مست ہے ..... یہاں کے باشندے، وہی عرب ہیں جن کو صحرا کی زندگی نے سخت جاں بنا دیا ہے اور سینہ بہ سینہ یادداشتوں کی عادت سے وہ قادر الکلام بن گئے ہیں جس پر ان کو ناز ہے۔ اپنے بڑے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی اپنی بڑائی و برتری کے راگ الاپتے اور اکڑ کر چلتے ہیں ...... نہ تو کسی چیز سے ان کے چمٹنے کی کوئی حد ہے نہ کسی کو دھتکارنے میں دیر لگتی ہے ..... ان کی زندگی تمام تر ایک وسیع اور سدابہار جشن ہے اور وہ اس جشن کی دوڑ میں بازی لے جانے والے سرخیل ہیں۔

ان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کا سلسلہ رکتا نہ تھا۔ ان کے بازاروں کی چہل پہل اور گرماگرمی دراصل شعر و سخن کی تخلیقات اور تیر و کمان اور پہلوانی کی ورزشوں میں مقابلے کی وجہ سے قائم تھی۔ وہ ایک جگہ سے تب ہی لوٹتے جب دوسری جگہ اپنا جھنڈا گاڑ لیتے تھے۔

مکّہ کی سڑکوں پر شور و شغب بلند ہو رہا تھا، خوشبو اور مستی شباب پر تھی، خواہشات اور لذت پرستی کی پیاس کسی طرح بجھتی نظر نہ آتی تھی ..... !!

دارالندوہ شہد کے چھتّے کے خلیوں کی طرح خاندانوں اور قبیلوں کے جوان اور بوڑھے سرداروں سے اٹا پڑا تھا۔

مورتیوں کے آستانے، کعبہ کے قرب و جوار میں، اور اس سے باہر کے میدانوں میں، لات، عُزّیٰ اور ہُبل کو پکارتے ہوئے جوق در جوق آنے والے زائرین کو دیکھ دیکھ پھولے نہ سمارہے تھے۔

بہت تھوڑے لوگ، بلکہ بجا ہوگا اگر ہم کہیں کہ شاذ و نادر افراد ان سڑکوں سے گذر کر پہاڑی چوٹیوں پر چڑھ رہے تھے۔ قریش کے لغو شور سے اپنے کانوں کو بہرہ بنائے ہوئے حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ دور سے، بہت دور سے دیدارِ حق سے شرفیاب ہونے کی تمنّا لئے آئے تھے

یہ لوگ حنفا یعنی ابراہیم حنیف (یکسو) کے طریقے کو ماننے والے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قریش کے ان معبودوں اور مورتیوں کے پیچھے ایک حقیقت پوشیدہ ہے۔ اَلحقُّ المُبین (واضح حق) ..... واحد و یکتا معبود، جو ساری کائنات کا رب ہے .... لیکن اس کی معرفت کا راستہ کیا ہے؟ ... اور وہ طاعت و قربانی کیسی ہو جس کے ذریعے اس کا تقرب حاصل ہو سکتا ہے؟

یہ لوگ دنیا سے یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جا رہے تھے مگر حق کو نہ پا سکے اور نہ دنیا والوں کو اس کے متعلق کوئی خبر دے سکے جبکہ انھوں نے اپنی عمریں اسی کی تلاش و تجسس میں کھپا دیں۔!!

بھیڑ بھاڑ کا شور برپا ہے ...... آسودگی اور بے فکری سے سرشار، گھما گھمی اور مسرتوں سے بھرپور زندگی کی بھیڑ بھاڑ کا شور۔ لیکن اندرونی طور پر دن رائگاں گذر رہے ہیں، پُرشور ہیں، نیکیوں اور برائیوں دونوں سے بوجھل ہیں۔ ..... ہیں تو نیکیاں بھی، مگر کمیاب !!

اس بھیڑ بھاڑ سے دور، ایک خوفِ خدا رکھنے والی رُوح بھی تھی، قابلِ فخر، پاکیزہ، گناہوں سے مجتنب روح، شرفِ حق کی طالب اور راہِ حق میں مشقتیں اٹھانے والی۔ ایک ایسے انسان کی رُوح جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام تر فضل و کمال اور عظمت کے سانچے میں ڈھالا تھا۔

اس کو فکر تھی، وہ برابر غور کرتا رہتا تھا کہ وقار کس طرح حاصل ہوگا، ..... اسے فہم و سمجھ کے متعلق کرید تھی، ..... وہ پاکیزگی میں جیتا تھا، .... اور اس کے جذبۂ عبادت میں تقویٰ کا رنگ تھا۔

لیکن اس کی عبادت اور تقویٰ کا رُخ کس کی طرف ہو؟!

اللہ کی طرف ..... بلاشبہ!

مگر اللہ تعالیٰ کی معرفت کہاں مل سکتی تھی ایک ایسے شہر میں جہاں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ان معبودوں کے سوا کسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوسکتی تھی، اور نہ اس شہر والوں کے ضمیر میں ان بتوں کے تقدس اور اس سے متعلق چرچے کے سوا کسی چیز کی پیاس ہی تھی ؟؟

یاد رکھو، اس گہرے چھائے ہوئے کہر میں بھی حقیقت کو دیکھ لینا، یقیناً مشکل نہیں ہے بشرطیکہ وہ ایسا شخص ہو جس نے اپنے نفس کے اندر اس کی جلوہ گری کے لئے جگہ بنائی ہو اور اس کے لئے اپنی زندگی کو وقف رکھا ہو!

جس زمانہ میں مکہ بتوں کا شہر بنا ہوا تھا، تو اس سے قبل حنفیت کے پاکیزہ تصورات کا مرکز تھا جس کی صدا ابراہیم علیہ السلام نے بلند کی تھی۔

اس لحاظ سے ایک ایسے شخص کے لئے جو ہمیشہ ان بتوں کو پیٹھ ہی دکھلاتا رہا ہو، مشکل نہ تھا کہ ذرا دیر ہی میں سہی لیکن حق کو دیکھ لے جس سے ماضی کے طویل دورِ قبل کی مگر تابناک تاریخ پھیلی نظر آتی ہو ......

یہی ہوا .... اس امانت دار شخص "محمدؐ بن عبد اللہ بن عبد المطلب ابن ہاشم کے ساتھ" آپؐ اپنے طرزِ فکر میں وہ نسبی تعلق پالیتے ہیں جو آپؐ کو ابراہیمؑ خلیل اللہ سے جوڑتا تھا جس کو بعد میں بہترین شکل عطا ہونے والی تھی۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں :-

" اللہ نے اولادِ ابراہیم میں حضرت اسمٰعیلؑ کو منتخب فرمایا۔

• اور اولادِ اسمٰعیلؑ میں کنانہ کو منتخب مقام عطا کیا"

• اور اولادِ کنانہ میں قریش کو وہ اعلیٰ مقام بخشا"

• اور قریش میں بنو ہاشم کو وہ مقام بخشا"

"اور بنی ہاشم میں اس نے مجھے منتخب فرمایا"۔

چنانچہ میں بہترین لوگوں کے بہترین لوگوں میں بہترین ہوں"

اس طرح وہ اپنے روحانی طریقے سے اپنی حاجت کی چیز پا لیتے ہیں اور خود اپنی قوم کی حاجت کی چیز بھی۔ بلکہ وہ چیز پا لیتے ہیں جس کی عالمِ بشریت محتاج تھی۔ یعنی ابراہیمؑ کی طرف از سرِ نو دعوت دینے کی حاجت ..... یہ دعوت لوگوں کو ان کے وجود کے نہایت بلند مقام پر لے جانے والی دعوت تھی، جہاں ان کو ان کے خالق و پروردگار اللہ تعالیٰ کے گرد جمع کر دیتی۔ اور ان کو اس ذاتِ واحد کے سامنے کھڑی کر دیتی، کہ اس کے بعد ان کو اس کے سوا نہ کسی سے ڈرنے کی حاجت تھی اور نہ کسی کی آس لگانے کی ضرورت .....

اسی کا نتیجہ تھا کہ آپؐ نے اپنی قوم کے بتوں کو ہمیشہ پیٹھ ہی دکھائی۔ اور مکہ میں جو کچھ شور و شر اور فتنے و ہنگامے اٹھتے رہے، آپؐ ان میں پیچھے رہے، ان کے تیر اندازی کے تماشوں، ان کی صحرائی شجاعت کے مظاہروں سے بلند ہو کر آپؐ مستقل مزاجی، عادات و اطوار اور جنونِ عشق میں اپنے جدِ امجد سیدنا ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام کے نقشِ قدم پر چلتے، ان کی رُوحانی خوشبو میں سانس لیتے رہے اور اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے آگے فروتنی اور یکسوئی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا فرماتے رہے کہ وہ آپؐ کو آپؐ کے جلیل القدر جد امجد اور رسولِ خلیل کے ورثہ کی طرف رہنمائی فرما دے اور ان کا عَلَم بلند کرنے اور ان کی مشعل کو لیکر چلنے کے لائق بنا دے۔!!

اس قوم میں ایک رسول کے ظہور کی خبریں ایک زمانہ سے ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اور شاید کہ جب آپؐ کے ایامِ طفولیت اور شباب کے یادگار واقعات دہرائے جاتے تھے تو آپؐ کے حق میں

ایسی باتیں نکلتی تھیں کہ گویا آپ ہی ان خبروں کو جلوۂ حقیقت بخشنے والے ہیں :

● کیا یہ وہی "دودھ پینے والا" نہ تھا جس سے قبیلہ سعد کی ان خواتین نے منہ موڑ لیا تھا جو مکہ میں "دودھ پینے والے بچوں" کی تلاش میں آئی ہوئی تھیں۔ آپ کی یتیمی کے سبب وہ آپ سے دور ہی رہیں۔ یہاں تک کہ "حلیمہ سعدیہ" کو جب آپ کے سوا کوئی بچہ نہیں ملا تو اللہ کی مدد کی دعا کرتے ہوئے آپ کو اٹھا لیا۔ ابھی انھوں نے اپنے وطن واپس ہونے کا سفر بھی شروع نہیں کیا تھا کہ ان کی لنگڑی گدھی ہوا سے باتیں کرنے لگی ..... اور ان کی لاغر بوڑھی اونٹنی کا دودھ اتنا بڑھ گیا کہ لوگ اس کو صبح و شام دوہنے لگے جبکہ اس سے پہلے وہ ایک قطرہ دودھ نہیں دیتی تھی، اس طرح وہ ابھی اپنی قوم کے درمیان پہونچی بھی نہ تھی اور یہ دودھ پینے والا ابھی ان کے درمیان جلوہ افروز بھی نہ ہوا تھا کہ اس کی برکتیں اور غیر معمولی نشانیاں محسوس ہونے لگی تھیں..... ؟؟

● کیا یہ وہی "دودھ پیتا بچہ" نہ تھا جس کو دودھ پلانے والی بی بی حلیمہ ہذیل کے قیافہ شناسوں کے پاس اٹھا لائی تھیں، اور وہاں وہ لوگوں کو روک رہی تھیں کہ وہ اپنے بچوں کو اس کے پاس اس کی قسمت کا حال معلوم کرنے کے لئے ابھی نہ لے جائیں۔ چنانچہ ابھی اس نے اس بچہ پہ پوری نگاہ بھی نہ ڈالی تھی بلکہ محض اس کے روشن چہرے کے خد و خال سے ہی بھانپ گیا اور پکار اٹھا :

"اے ہذیل کے لوگو ! اے گروہِ عرب ! اس بچے کو قتل کر ڈالو ، ورنہ ....

معبودوں کے حق ہونے کی قسم ! وہ تمہارے دین کے بخیے اُدھیڑ کر رہے گا ، تمہارے بتوں کو پاش پاش کر ڈالے گا اور تم پر اپنا حکم چلا کر رہے گا...."

حلیمہ نے یہ سنتے ہی اُس کے سامنے سے بچے کو اُچک کر لے لیا اور خوف سے ہانپتی کانپتی وہاں سے بھاگیں۔

● کیا یہ وہی نہ تھا جس کو ایک دن دوپہر کے وقت جب بی بی حلیمہ نے غائب پایا تھا جبکہ تپش نہایت سخت تھی آخر کافی سعی و تلاش کے بعد اس کو صحرا میں سویا ہوا پایا تھا جبکہ آفتاب لوہے کو پگھلا رہا تھا مگر یہ بچہ سایہ کے ایک ایسے دائرہ میں پڑا تھا جس نے اس کے جسم کو بالکل سامنے سے گھیر اپنا ئے ڈھانک رکھا تھا اور آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ حلیمہ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو بادل کا کوئی ٹکڑہ بھی نہ تھا، اور زمین بھی زیادہ گرم نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہے جو اس بچہ پر سایہ ڈال رہی ہے لیکن ان کو کوئی چیز کہیں نظر نہ آئی۔ اس مبارک منظر کو وہ اپنے قلب و ذہن میں پرورش کرتی رہیں کہیں کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ بچے کی طرف لپکیں، اس کو منھ سے لگایا، جھپٹ کر اٹھا لیا، بوسے لئے اور فرطِ مسرت کی آواز نکالتی ہوئی اپنے لوگوں اور اپنے گھر کی جانب واپس آگئیں۔۔۔؟؟؟

● کیا یہ وہی "جوان" نہیں تھا جس کو شام کے سفر میں بُحَیرا راہب نے دیکھا تھا۔ اور دیکھتے ہی بے ساختہ اللہ کی تسبیح و تقدیس اس طرح کرنے لگا تھا کہ فضا گونج اٹھی تھی، پھر اس نے اس لڑکے کے پاس آکر اس کی خوشبو کو سونگھا تھا اور اس کی قسمت کے لئے راستی کی دعائیں کی تھیں، پھر آپؐ کے چچا ابو طالبؓ کے سامنے کھڑے ہو کر نصیحت کی تھی کہ خبردار! اس کو یہود کی نظروں سے بچائے رکھنا......؟؟

● کیا یہ وہی شخص نہ تھا جو اپنے عین عالمِ شباب میں پاکیزگی، صداقت، امانت، استقامت اور للّٰہیت کا پیکر رہا، یہاں تک کہ تمام اہلِ قریش کا رویہ آپؐ کے ساتھ ایسا تھا کہ گویا آپؐ ان کے امیر و سردار ہوں۔

اور یہ زمانے سے چلی آنے والی خبریں، اب جو تیزی کے ساتھ گشت کرنے لگی تھیں، ان کو دین حنیفیت کا ماننے والا آخری شخص زید بن عمرو بن نُفیل، یکجا کر کے یوں رقمطراز ہوتا ہے :-

شاممت اليهودية والنصرانية	" میں نے یہودیت اور نصرانیت
فكرهتهما فكنت بالشام	کو سونگھا ان میں مجھے کراہت
وما والاه، فأتيت راهبا في	محسوس ہوئی، میں شام کی ایک
صومعة، فذكرت له	جگہ پر تھا، وہاں میں ایک راہب
كراهتي لعبادة الأوثان	سے ملا، ایک خانقاہ میں، اور
وارتيابي في اليهودية	میں نے اس سے اپنی کراہت کا
والنصرانية ــ فقال لي :	ذکر کیا، مورتیوں کی پوجا، یہودیت
يا أخا العرب، إنك تطلب	و نصرانیت کے متعلق اپنے شکوک
دينًا ما أنت بواجد من يملك	بیان کئے، تو اُسنے مجھ سے کہا:
اليوم عليه : ولكن قد أظل	اے عرب بھائی! تم دین کی تلاش
زمان نبي يخرج من بلادك	میں ہو، تمکو آج ایسا کوئی شخص
التي جئت منها، يُبعث بدين	نہیں ملیگا جو تمکو یہ چیز دے سکے،
ابراهيم حنيفا مسلمًا، فارجع	البتہ ایک نبی کا زمانہ آچکا ہے جو
إلى بلدك، فانه على وشك	تمہاری سرزمین سے اٹھیگا، جہاں سے
أن يبعث هذا زمانه	تم آئے ہو، وہ ابراہیم کا دینِ
هذا زمانه	حنیف لئے مسلم بن کر اٹھیگا"

بقیہ اصل لفظ: تم اپنے وطن لوٹ جاؤ، اس لئے کہ بعثت ہونے کا وقت آن پہنچا ہے ..... یہی اس کا زمانہ ہے ..... یہی اس کا زمانہ ہے .....

ہم نے کہا : لوگ خوشی کے مارے اس کا راگ الاپ رہے تھے کہ اللہ کے فضل اور اسکی نعمت کی بدولت یہی شخص اس وعدہ کا مصداق ہے۔

کون ہوگا جو اللہ کی جانب سے اس شخص کے منتخب و مامور کئے جانے کے شرف پر گردن اٹھا اٹھا کر اس پر نظر نہ ڈال رہا ہوگا۔ .....؟

باوجودیکہ جن خبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ان میں جو دلیلیں آپؐ کے حق میں صادق آئی ہیں وہ ____ جیسا کہ آپؐ کی سیرت سے ظاہر ہے ____ وہ حق کو پالینے کے سلسلے میں آپؐ کے اخلاص، آپؐ کی خشیت، آپؐ کی عاجزی و فروتنی اور اس اللہ کے لئے آپؐ کا جذبۂ عبودیت جس نے آپؐ کے قلب کو ہدایت سے معمور کر دیا، نہ تو آپؐ کی اس کیفیت میں ذرہ برابر اضافہ کرتی ہیں اور نہ بعد میں پیش آنے والی کیفیت میں جو یقینی خبر..... یا واضح وحی آنے کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔

آپؐ کی روح اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے لپکتی تھی اور اس بات کی تڑپ آپؐ کے اندر موجود تھی کہ اللہ جس قسم کی عبادت اپنے بندوں سے چاہتا ہے وہ معلوم ہو جائے..... اس لپک کی غرض یہ تھی کہ روح کی پیاس بجھے اور اس کے اندر موجود حصولِ معرفت کی بھوک مٹے..... اور یہ کہ اللہ آپؐ کو اپنی عبادت کے طریقے بتلا دے پھر آپؐ کو اپنے متقی اور وفاشعار بندے کی حیثیت سے قبول فرمائے.... چنانچہ جب اس ذات پاک کی جانب سے آپؐ کیلئے نعمتیں مہیا کی جانے لگیں تو آپ کو وافر حصہ ملے اور اللہ کا پورا پورا فضل آپؐ کے شاملِ حال ہو..... اور آپؐ کو ایک رسولؐ کی حیثیت سے منتخب فرمالیا جائے تاکہ آپؐ اس کے پیغامات پہونچائیں اور اس کے بندوں کو اس کی راہ پر لگائیں۔

ویسے تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی جانب سے منصب رسالت پر کس کو سرفراز فرمائے۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جس کو مناسب سمجھے عنایت فرمائے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس طرح آپؐ بڑے ذوق و شوق اور حوصلہ کے ساتھ ہمہ تن اپنے رب کے سامنے دعائیں کرنے میں غرق رہتے، اس کی بادشاہی کے متعلق غور و فکر کرتے رہتے، اس امر سے قطعاً بے پرواہ کہ آپ کے ٹھیک پیچھے مکہ میں کیسی چہل اور بھیڑ بھاڑ تھی۔

آپؐ عزلت پسند ہو گئے تھے۔ چنانچہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت خلوت کے لئے فارغ رکھتے چنانچہ جب آپؐ کے گھر کی خلوت آپؐ کی روحانی آفاقیت کے لئے کافی نہ ہوتی تو آپؐ غارِ حرا کا سفر فرماتے اور وہاں سال میں کم از کم ایک ماہ ضرور گذارتے، یہ اوقات اللہ کی یاد اور عبادت میں گذرتے، کیونکہ یہاں نہ تو کتوں کے بھونکنے کا کوئی شور تھا اور نہ کسی سانس لینے والے کی آواز ہی سنی جا سکتی تھی۔۔۔ بلکہ انتہائی سناٹا تھا، اتنا سناٹا کہ رگوں میں دوڑتے خون کی آہٹ بھی سنی جا سکتی تھی!

ہر نئے دن کے ساتھ ساتھ آپؐ کی روح کے اندر ایک نئی صفائی اور جلا پائی جاتی تھی اور وہ منزل سے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔

اب آپؐ پر نبوت سے ملتی جلتی کیفیتوں کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ ......

یہ لیجئے! اب رویائے صادقہ کی نعمت بھی آپؐ کو میسر آچکی ہے۔ اب آپؐ جو بھی خواب دیکھتے وہ گویا سپیدۂ صبح کے مانند واضح ہوتا..... !!......

اور اب حال یہ تھا کہ غارِ حرا کی خلوت کا جو ایک ماہ مقرر تھا وہ ناکافی ہو چکا تھا..... لہذا آپؐ نے دنوں کو دو حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا۔ چند ایام مکہ کی اپنی رہائش گاہ پر گذارتے اور چند ایام

غار کی عبادتوں کے لئے ہوتے .... !!

۶۱۰ء (میلادِ مسیحی) کے ماہِ رمضان میں دن کا ایک وقت تھا، آپؐ اسی غارِ حرا کے اندر تشریف فرما تھے کہ پیشین گوئیوں کے مطابق وہ دن آگیا ...... وحی اور منتخب کئے جانے کا دن۔

آپؐ کے پاس ایک فرشتہ نمودار ہوا۔

یعنی ایک عالمِ تاباں و درخشاں تھا ___ جو جلال اور خیر و ہدایت سے معمور تھا ___ کے دروازوں کو دنیا والوں کے لئے جن کلمات نے کھول ڈالا تھا، وہ یہی تھے کہ "آپؐ کے پاس ایک فرشتہ نمودار ہوا".....؟؟ !!

یاد رکھو! قبل اس کے کہ ہم اس تازہ خبر کو دور تک لے جائیں، ہماری ذمّہ داری ہے کہ اپنے اس بارِ گراں کو ہم محسوس کریں کیوں کہ ہمیں واضح خبروں اور عظیم دلائل و اشارات کے پہلو سے اپنے موضوعِ سخن پر قائم رہنا ہے۔......

شایانِ شان بات یہ ہوگی کہ ہم اس امانت دار شخصیت "محمّد" صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف صمیمِ قلب کے ساتھ مائل ہوں جو عین اسی لمحہ ربِّ کائنات کے رسولؐ بن گئے۔

آؤ! ہم اس رسولِ امین کی طرف اپنا رُخ کرلیں جنھوں نے غارِ حرا کے مناظر اور یومِ وحی کا تعارف خود اپنی گفتگو کے ایک سلسلے میں یوں کرایا ہے:

"... فرشتے نے کہا: پڑھ .....

میں نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں ....

میرے اس جواب پر اس نے مجھ کو پکڑا اور زور سے بھینچ لیا یہاں تک کہ میں نے اس سے چھوٹنے کی کوشش کی۔

پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا : پڑھ.....

میں نے کہا : میں پڑھا ہوا نہیں ہوں.....

یہ کہتے ہی اس نے مجھے پکڑا اور زور سے بھینچ لیا۔ ایسا تین بار ہوا ، یہاں تک کہ میں نے چھوٹنے کی کوشش کی۔

پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا :

" پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا......

جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے.....

پڑھ ، اور تیرا ربِ اکرم وہ ہے......

جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

انسان کو وہ چیز سکھائی جو وہ جانتا نہ تھا...."

(اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ)

یہ تھا یومِ انتخاب کا افتتاح۔ آپؐ کی مبارک گھڑیوں نے وقت کی گھنٹی بجائی۔ اُس وقت آسمان نے اپنی اس "منتخب و مختار" شخصیت کا اعلان کیا جس کا ایک مدت سے ہر طرف انتظار تھا...... گویا کتابوں کے الفاظ درست ٹھہرے اور خفیت کے قائلین اور لبادۂ تقدس اوڑھنے والوں کی باتیں صادق آئیں.......

وہ دیکھو ، زندگی کی ہماہمی سے دور ایک گوشے میں ، پہاڑ کی چوٹی پر ایک گہرے غار

ں، جہاں ایک پاکباز عابد اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر راہنمائی طلب کر رہا تھا، اس کے پاس، ایک آسمانی سفیر اپنے جلال کے ساتھ اُتر کر آتا ہے۔ اللہ کی روشنی لئے وہ ایک ایسے شخص کی طرف آتا ہے جس کے ذریعے اس ہر دلعزیز عابدِ متفکر کو امام اور معلم بنایا گیا۔ ابراہیمؑ کی اولاد، ان کی دُعاء اور بشارت ..... !!

ذرا سوچو تو سہی، اگر ــــــ دنیا کے ان ایام میں ــــــ یہ یومِ وحی نہ آتا تو آخر بشریت کس راہ پر لگتی .....؟؟ وہ کلمہ، وحی کی جس سے ابتدا ہوئی، دراصل رسولؐ اللہ کے ساتھ ایک سرگوشی تھی، تاکہ ان کلمات کے ذریعے اس سوال کا ہمیں جامع .... کافی وشافی .... اور بہترین جواب مل جائے.....

چونکہ علم دراصل سیارۂ ارض کی پشت پر انسان کی قائم کردہ تہذیب وتمدن کا جوہر ہے۔ اور چونکہ اسلام نے ــــــ بعد میں ــــــ دنیا کو تہذیب عطا کی، ایک ایسی کامل تہذیب کہ اس کے بعد جنم لینے والی ہر تہذیب اس کی مقروض ہے، خود وہ تہذیبیں بھی جن کا تمام تر نشانۂ عداوت یہی اسلامی تہذیب ہے .....

اس لئے ان دونوں حقائق کو سامنے رکھ کر ہم بآسانی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ان شب و روز کے درمیان، بلکہ زمانہ کے اس سِرے پر، یہ یومِ وحی یوم "اقرا باسم ربک" یومِ قرآن" یومِ "محمدؐ" الیومِ" اسلام " واقع نہ ہوا ہوتا، تو انسانیت کا رنگ ڈھنگ اور انجام کیا ہوتا۔؟

اسی طرح ہم یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ کا سب سے پہلا لفظ جو رسولؐ کو دیا گیا

وہ لفظ " پڑھ " ہی کیوں تھا......

لفظ " نماز پڑھ " نہیں تھا، لفظ " روزہ رکھ " تھا اور نہ لفظ " عبادت کر " تھا، بلکہ لفظ تھا " پڑھ "

دراصل یہی لفظ اسلام کا جوہر اور اس کے مستقبل کا نچوڑ ہے .....

چنانچہ یہ دین نہ تو محض اپنی خدمات اللہ کے لئے مخصوص کر دینے کا دین تھا اور نہ سلوک کی منزلیں طے کرنے کا دین تھا، بلکہ وہ تو ان سب کے وجود سے بھی قبل اور ان سب سے بلند تر " ایک تہذیب کا دین "، رہا ہے.... اس کے آنے کی غرض یہ تھی کہ لفظ " عالم " اور " جدید " سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے اور جس چیز کا اشارہ ملتا ہے، ان سب کا مصداق ایک " عالمِ جدید " وجود میں لے آئے۔

پھر اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ لوگوں کو ان سبق آموز اشارات سے اس بات کا یقین آجائے کہ یہ آنے والی تہذیب دراصل آسمانی عطیہ ہے، اس مشن کے لئے جو استاذ اور آخری بار اس کی بنا ڈالنے والا منتخب کیا گیا وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا اس سے قبل قلم اور کتب سے کسی طرح کا کوئی لگاؤ بھی نہ تھا..... اس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ یہ دین اور یہ تہذیب ہرگز اس شخص کا اپنا اختراع نہیں ہے ..... بلکہ وہ شخص تو اللہ کی جانب سے محض پہونچانے والا ہے...... آسمان سے جو چیز مل رہی ہے اس کو زمین تک منتقل کرنے والا ہے .... اور یہی وہ لفظ ہے جہاں سے قدرت کی جانب سے زمانہ کی ساخت کو تمام تر انسانی ساخت اور زندگی کے پورے ڈھانچے کو بدل کر رکھ دینے والی چیز اس کے شاملِ حال ہو جاتی ہے۔

اور کون جانتا ہے ..... شاید فرشتے کا آپؐ کو اتنے زور سے بھینچنا کہ آپؐ کی پسلیاں

اس کے دباؤ سے اینٹھنے لگی تھیں، جس کو خود لسانِ نبوتؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

"تو اس نے مجھے اس زور سے بھینچا کہ میں نے سمجھا کہ اب بس مجھے موت آ گئی ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ شاید آپؐ کے جسمِ اطہر کی ساخت میں ایک خوشگوار تبدیلی لانا مقصود تھی جس کے تحت ایسا کیا گیا، بلکہ جسم کے ساتھ روح کی ساخت میں بھی تبدیلی مقصود ہو ـــــــ "آپ پر بہترین صلوٰۃ وسلام ہو" ـــــــ تاکہ آپؐ کا جسم اور آپؐ کی رُوح ایک نئی قوت کی حامل بن جائے۔ جو بارِ رسالت اور آفاتِ مدافعت کو انگیز کر سکے۔

اس پہلی وحی کے بعد وحی کا سلسلہ تین سال کی مدت تک منقطع رہا، شاید یہ بھی ایک ضروری امر تھا، تاکہ جسم و روح وحی کے ساتھ ساتھ آنے والی اس نئی الٰہی قوت کو جذب کر سکے، اس حد تک کہ آپؐ کی بشری ساخت میں اس بالائی مدد کے ذریعے اس قسم کی تبدیلی آجائے جیسی اللہ کے فرشتے جبریلؑ آپؐ کو تین بار بھینچ کر آپؐ کے اندر لانا چاہتے تھے۔

اب آیئے! ہم یومِ وحی کے بقیہ بابرکت لمحات کی طرف چلیں۔

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غارِ حرا سے اپنا قدم ذرا تیز تیز نکالتے ہیں، مگر خوف کی ایک کیفیت ہے کہ آپؐ کے قدموں کو زیادہ بڑھنے نہیں دیتی۔ آپؐ اپنی ذات سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسی بات اچانک واقع ہو گئی، اس کے لئے انتظار کی مہلت بھی نہیں لگی ....؟ آپؐ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں، پھر سامنے دیکھتے ہیں، پھر داہنے بائیں نظر ڈالتے ہیں۔ آپؐ کو اطمینان

ہوجاتا ہے کہ آپؐ تنہا ہیں، کوئی آپؐ کا پیچھا نہیں کر رہا ہے ...... اس کے برخلاف افق سے ایک عجیب وغریب قسم کی روشنی اچانک چمک اٹھی جب اس کی طرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھا کر دیکھنا چاہتے ہیں .... تو افق ہیبت وجلال سے معمور نظر آتا ہے .... عین وہی کیفیت جو چند لمحات قبل غارِ حرا میں فرشتے کی موجودگی میں چھائی ہوئی تھی، اب ہلکی ہلکی کپکپی آپؐ کے جسم کو جیسے از سرِ نو جھاڑے دے رہی ہو۔ ان اثرات میں آپؐ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کدھر جا رہے ہیں۔ آپؐ کے پاؤں زمین سے چمٹے جا رہے تھے اور کان میں یہ ندا آرہی تھی۔ :

"اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم)"

"تم، اللہ کے رسولؐ ہو، اور میں جبرئیلؑ ہوں۔"

یہ سنتے ہی آپؐ کو اس منظر کی قدر ومنزلت نے ڈھانک لیا۔ اور آپؐ کے قدم یکے بعد دیگرے اس طرح بوجھل ہو رہے تھے گویا کہ زمین سے اُگنے والا پودا ہو جو اپنی زمین سے چمٹا کھڑا ہوتا ہے۔!!

اب روشنی غائب ہوگئی۔ ساتھ ہی فرشتے کے مشاہد بھی غائب ہوجاتے ہیں، اور اللہ کے رسولؐ اب اپنی چال از سرِ نو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ اپنے پنجوں کو کنکریوں پر آگے کی طرف دبائے ہوئے ہیں ..... ایسا لگتا تھا کہ اب آپؐ اپنے گھر پہونچ کر اپنی شریکِ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے نہیں مل پائیں گے، اس حال میں پہونچتے ہی اپنے آپ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے کمرہ میں جاکر ان کے دامن میں ڈال دیتے ہیں، آپؐ کا سارا جسم بھونچال کے مانند کانپ رہا تھا۔

آپؐ کے پریشان کلمات اور بے قابو سانس پر حضرت خدیجہؓ نے کان لگایا .... آپؐ نے پورے واقعہ کی تصویر یوں کھینچی گویا وہ خود مشاہدہ کر رہی ہوں۔

حضرت خدیجہؓ کا چہرہ امید ویقین کی روشنی سے چمک اٹھا، اور وثوق کے ساتھ

بولیں :۔

"اے میرے چچا کے بیٹے خوش ہو جاؤ اور ثابت قدم رہو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں خدیجہ کی جان ہے، میں امید کرتی ہوں کہ آپؐ اس امت کے نبی ہوں گے"۔

جب آپؐ کی کپکپی کم ہوتی جارہی تھی اور سکون آرہا تھا، تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

" مجھے اپنے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے"۔

حضرت خدیجہؓ تسلّی دیتی ہیں:

" ہرگز نہیں، آپؐ خوش ہو جایئے .... خدا کی قسم، ہرگز اللہ تعالیٰ آپ کو غم میں نہیں ڈالے گا"۔

" آپؐ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں"۔

" بات ہمیشہ سچّی کہتے ہیں"۔

" کمزوروں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے ہیں"۔

" مہمان نوازی میں پیش پیش رہتے ہیں"۔

" قدرتی مصیبتوں میں گھر جانے والوں کے لئے آپ مددگار بنتے ہیں"۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اس تجربہ سے سابقہ پیش نہیں آیا جس سے غارِ حرا میں اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو گذرنا پڑا ..... وہاں اچانک جو کچھ وقوع پذیر ہوا ۔۔۔ وہ

واقعات جن کو پیش آنے میں محض چند لمحات کی دیر لگی، ایسے تھے گویا زمانہ کے لحاظ سے ان میں صدیاں لگی ہوں..... وہ اُن سے بہت دُور رہیں..... !!

اسی سبب سے ایسے کلمات آپؐ کے سامنے اطمینان و سکون کے ساتھ کہنے کا ان کو موقع تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین اجر سے نوازے، ان کا یہ اندازِ فکر بالکل برمحل تھا ایک ایسے شخص کے معاملہ میں جس نے ان کو ذاتِ رسالت کی شریکِ حیات بننے کے لئے خوب سوچ سمجھ کر پسند فرمایا تھا۔ !!

ایک قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر حضرت محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی نظر پہلے سے نبوت کے بلند مرتبے پر لگی ہوئی ہوتی، اور اگر آپؐ اپنے حاصل کردہ وسائل کے ذریعے مصنوعی طور پر بزورِ محنت اس مرتبے پر پہونچ جانے کی خواہش میں مبتلا ہوتے ـــــ تو کیا وحی کے آجانے پر آپؐ کا یہ حال ہو سکتا تھا؟ اور آپؐ کی جو کیفیت مشاہدہ میں آئی، وہ کیفیت آپؐ پر طاری ہوتی....؟

ہرگز نہیں،..... بلکہ آپؐ کو تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ قدرت یہ نعمت بخشنے کے لئے آپؐ ہی کو منتخب کر رہی ہے۔

بلکہ اس کے برخلاف، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تو بس پروردگارِ حقیقی خداوندِ عالم سے لَو لگائے بیٹھے تھے.......

ہر شئے کی اپنی ایک فطرت ہوتی ہے، اس لحاظ سے یہ ممکن نہ تھا کہ "حضرت خدیجہؓ" اس واقعہ کا اثر قبول نہ کرتیں، اس کے باوجود انھوں نے تسلی دینے والے کلمات کہے جو، ان کے حکیمانہ ذہن نے ان کی زبان پر جاری کئے، تاکہ اللہ کے رسولؐ پر سے مشاہدہ کا وہ اثر زائل ہوجائے جو

آپ پر طاری تھا۔

فطرتِ اشیار کے اعتبار سے بھی اور فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بھی، یہ ممکن نہ تھا کہ اس خوف کا ایک حصّہ ان کی جانب بھی منتقل نہ ہو۔ چنانچہ آپ کی ظاہری تسکین دہانی کے کلمات کے پیچھے بہرحال ایک اندیشہ موجود تھا جس پر وہ پردہ ڈال رہی تھیں۔

یہ درست ہے کہ یہ واقعات و مشاہدات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گذرے تھے، اس لئے تناسب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ کا خوف قابل ذکر حد تک نہ تھا.... لیکن بہرحال آپ بھی خوف و حیرانی کے اثر سے مبرا نہ تھیں...... یہ احساس انسانی ذہن میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب وہ کشمکش و پیچ اور بے قراری میں گھر جاتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ ہی کی یہ عظیم و منفرد شخصیت تھی جس نے اس اچانک اور پہلی بار پیش آنے والے واقعہ کو خندہ پیشانی اور ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کیا..... رہے اس واقعہ کے بقیہ حصّے، تو ان کو اب ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہوا، اس کی کوئی صحیح تعبیر حاصل کی جائے تاکہ وہ جو، ہر وقت اندیشہ لگا ہوا تھا، اس کی جانب سے تسکینِ مزید اور اطمینان قلب حاصل ہو جائے..... چنانچہ اس کی ایک صورت یہ سمجھ میں آئی کہ اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جائیں ـــــ (یہ ان لوگوں میں سے تھے جو، ان دیوتاؤں اور مورتیوں کی پوجا کو بُرا سمجھتے تھے..... اور بطور خود، دینِ حق کی جستجو میں غور و فکر کرتے رہتے تھے.... چنانچہ جب ان کو اس دینِ آبائی سے باز رہنا نصیب ہو گیا تو انھوں نے نصرانیت کے ایک ایسے مرکز کا سفر کیا جہاں ان کے مذہب میں مسیحؑ کو الٰہ نہیں، بلکہ بشر سمجھتے تھے.....)

اس طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آمادہ کیا کہ

دونوں ورقہ کے پاس چلیں، شاید کوئی رائے اور تعبیر مل جائے .... ورقہ بن نوفل تورات اور انجیل کا گہرا علم رکھتے تھے..... ان کی زندگی کا اچھا خاصہ حصّہ اس تلاش میں گذرا تھا کہ وہ دینِ حق کیا ہے جس کے مطابق اللہ کی بندگی کریں۔ اس غرض سے جو سفر کرتے رہے اس میں بہت سے علماء و مشائخ اور مصروفِ عبادت لوگوں سے واسطہ ہوا۔ ان لوگوں کے یہاں وہ برابر ہی یہ خبر سنا کرتے تھے کہ دینِ ابراہیم کو زندہ کرنے والا ایک رسولؐ بس آنے ہی والا ہے۔ اس کے ظہور کا وقت ہو چکا ہے، بلکہ بعض خبریں اس سے بھی آگے، یہاں تک ہوتی تھیں کہ ان سے اس نبیؐ کے ظہور کا مقام متعین ہو جاتا تھا اور وہ مقام مکہ اور اس کے گرد و پیش کا تھا۔

ورقہ بن نوفل زندگی کے بقیہ دن اسی ظہور قدسی کے انتظار میں گذار رہے تھے اور اپنے دل میں یہ تمنا لئے بیٹھے تھے کہ کاش! اس نبیؐ کی صحبت نصیب ہو جاتی جس کی آمد کا وقت قریب آ لگنے کی خبریں پہچان رکھنے والے تمام لوگ دے رہے تھے۔ اسی تمنا کے تحت اس رسولؐ کے انتظار میں مکہ کو انھوں نے مستقر بنا لیا تھا۔

چنانچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہانے، جو اپنے شوہر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعات کو انکے سامنے خود پیش کرنا نہیں چاہتی تھیں، بس اتنا کہا کہ:

" بھائی جان، اپنے بھتیجے کی بات سنو۔"

اس بات پر ان کے اندر گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اللہ کے رسولؐ کی طرف متوجہ ہوئے اور پُرجوش طریقے پر ان کی جانب مائل ہو گئے۔

ابھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات پوری بھی نہ کر پائے تھے کہ ورقہ شور کرنے لگے ان کا چہرہ چمکنے لگا، بڑھ کر اللہ کے رسولؐ کو گلے لگا لیا اور کہنے لگے:

" یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر نازل کیا گیا تھا! کاش!
میں اس وقت زندہ رہ جاؤں جب تم کو تمہاری قوم
نکال دے گی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا:

"تو کیا لوگ مجھے نکال دیں گے؟"

ورقہ جواب دیتے ہیں:

"ہاں! ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جب بھی کوئی شخص وہ چیز
لے کر آیا، جو تم لائے ہو تو اس کے ساتھ عداوت کی گئی، اگر
مجھے تمہارا دن نصیب ہو گیا تو میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔"

اس طرح نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ یقین بھرے لہجے میں ورقہ نے وہ سچی خبر سنادی جو نبوت کے ایک عرصہ قبل ہی اس کے متعلق پائی جارہی تھی۔

اور خود وہ یہ تمنا لئے بیٹھے تھے کہ ظہور کا دن ان کو نصیب ہو جائے تاکہ سب سے پہلے ایمان لانے والے اور سب سے بڑھ کر حمایت و نصرت کرنے والے بننے کا فخر حاصل کر سکیں۔

لیکن عین اس کے قریب ترین زمانہ میں ظہورِ نبوت کے اس عظیم دن کے جلوہ گر ہونے سے قبل ہی ان کے لئے موت کی آغوش میں چلے جانا مقدر ہو چکا تھا۔

گویا ظہورِ نبوت کی علامات دیکھنے کی خوشی میں ڈوب جانے کے باوجود اس رسولؐ اور ان کے اس "جدید طریقۂ بندگی" پر ایمان لانا ان کی قسمت میں نہ تھا۔

وہ یوں کہ اس دین کی باقاعدہ توثیق کا اعلان ابھی نہیں ہوا تھا.... اور رسولؐ اللہ کو

ابھی حکم نہیں ملا تھا کہ آپؐ کسی بات کی خوش خبری لوگوں کو سنائیں یا کوئی بیعت لیں۔

ابھی آپؐ کے "یومِ وحی" کے اوقات گذر رہے تھے........ "یومِ اِقرأ باسم ربک الذی خلق" کے اوقات۔ اب اس کے بعد "یومِ ظہور" آئے گا ..... "یٰاَیُّھَا المُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ" کا مرحلہ

اِن دونوں کے درمیان کوئی مختصر نہیں، بلکہ ایک طویل عرصہ گذر گیا جب وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس معاملہ کی حکمت کو تو وہ "ذاتِ علیم و حکیم" ہی بہتر جانتی ہے۔

اِس مہلت میں، اللہ کے رسولؐ کی رُوح نے اس نئی روشنی کو جذب کیا۔ اور آنے والی عظیم ذمہ داری قبول کرنے کی تیاری جاری رکھی۔

اس دوران میں آپؐ کے اندر وحی کی لذت سے ایک بار پھر ہمکنار ہونے کا زبردست شوق ہر خوف اور سراسیمگی پر غالب آرہا تھا۔ اور آپؐ کی روح کے اندر آہٹوں پر کان دھرنے یا سوالات کے مرحلے سے گذرنے کے اندیشوں کے برخلاف ایک خاص میلان پرورش پا رہا تھا۔

ہاں! آپؐ کے اندر جو بے پناہ ذوق و شوق امڈنے لگا تھا، بس یہ بات اس کے حصے میں چھوڑ دی گئی تھی کہ دوبارہ جب وحی آئے، اس وقت تک اس وحی کے ساتھ تعلق کے لئے آپؐ کے دل میں ایک مقام تیار کر دے اور آپؐ کے اندر وہ انتہائی صلاحیت پیدا کر دے جو وحی کی صحبت کے لئے درکار تھی۔

دوسری طرف، ہم نے آپؐ ــــــ علیہ الصلوٰۃ والسلام ــــــ کو بھی دیکھا کہ آپؐ اپنی آمادگی کے ساتھ شوقِ انتظار میں پہاڑ پر چلے جاتے تھے، آسمان کی طرف نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھتے، محبت اور امید کی کیفیتوں کے ساتھ آپ کی پلکیں آنسو نچوڑ لاتیں اور ڈبڈبائی ہوئی ہوتیں۔ خوشی میں ڈوبی آواز سے چیخ مارتے، شاید وہ روح القدس آپؐ پر احسان کرتے ہوئے جلد آنے کی زحمت کریں۔

لیکن روح القدس خود اپنے اوپر اختیار سے محروم تھے جیسا کہ بعد میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے بتلایا کہ :

"وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ	ہم تو بس تمہارے رب کے حکم سے ہی اترتے ہیں"
لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا	ہمارے سامنے اور ہمارے پیچھے'
وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ"	اور ان سب کے درمیان ہر طرف اسی کا اختیار ہے۔
"وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" (مریم : ۶۴)	اور آپؐ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

اس فرشتے کو دیکھنے کی امید لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا آپؐ کا معمول بن چکا تھا۔ آپؐ کے اندر جو۔ ذوق وشوق موجیں مارتا نظر آتا تھا، اس کے غم کی جو آگ بھڑک رہی تھی، اور گھبراہٹ کے جو بادل چھائے ہوئے تھے، اس فکر میں کہ کہیں اللہ تعالیٰ اپنا یہ سلسلہ روک نہ لے اور آپؐ کو چھوڑ نہ دے .... اس لئے آپؐ ہر چیز سے بے پروا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود آپؐ اس حد تک نہیں گئے کہ غم کے مارے خود زندگی ہی سے چھٹکارا پالینے کا کوئی رجحان آپؐ کے اندر پیدا ہوا ہو، ـــــ جیسا کہ بعض اقوال سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع کا ہر عنصر اس قول کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔

بھلا پختہ شخصیت اور بلند اوصاف کے حامل محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ـــــ ایسا کرنا تو درکنار، ایسی بات سوچ بھی سکتے تھے۔؟

پھر جب شوق اللہ کے رسولؐ پر آپؐ کے حسب منشا اس طرح ابلتا آرہا ہو، تو آپؐ کے شایان شان بات تو یہی ہو سکتی تھی کہ آپؐ "امید ورجا" کا دامن پکڑے رہتے، ناکہ مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہوتے۔

آپؐ کے بلند مقامات کو پسند کرنے کی غرض یہ تھی کہ آپؐ وہاں چڑھ کر خود اپنے نفس سے باتیں کر سکیں اور اپنی توقعات کو احساس وادراک میں لاسکیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ غور و فکر، تلاشِ سکون اور دل میں خود بخود باتوں کے اترنے کے لئے بلند مقامات ہمیشہ موزوں ترین ہوا کرتے ہیں۔

دیکھو، کتنی نمایاں حکمت پوشیدہ تھی ـــــ اس امر میں کہ وحی کو ان سے ایک مدت تک کے لئے روک رکھا گیا۔ اس طرح آپؐ کی روح کو موقع مل گیا کہ حضرت جبریلِؑ امین کے ساتھ پہلی ملاقات میں آپؐ کو جو نور ملا تھا اس کو اچھی طرح جذب کرلیں۔

دوسری طرف آپؐ کے لئے یہ موقع فراہم کرنا مقصود تھا کہ آپؐ کی شخصیت میں جو قوتیں موجود تھیں، آپؐ ان سب کو سمیٹ کر اپنی پوری صلاحیت کو وحی کی صحبت کے طویل دَور کے لئے استوار کرلیں ـــــ اس دَور کے لئے جو مکمل طور پر تیئیس (۲۳) سال تک جاری رہنے والا تھا۔

تیسری طرف ایک پختہ اور پُرجوش ذوق وشوق کی تحریک کے ذریعے آئندہ وحی کے ساتھ ہونے والے آپؐ کے تعلق کو جمادُ عطا کرنا بھی پیشِ نظر تھا۔

پھر اس کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ آپؐ کو (اپنے متعلق فیصلے کا) حق دیا گیا تھا کہ آپؐ دو میں سے ایک راہ اختیار کرلیں۔ اگر آپؐ چاہیں تو اپنے اندر طاقت محسوس ہو یا نہ ہو، بہرحال لبادۂ رسالت اوڑھنے کی ہمت لئے آگے بڑھیں، ورنہ اگر آپؐ چاہیں تو وحی کے ساتھ عہد ومیثاق کا ربط پیدا ہونے سے قبل ہی اس کو موخر کردیں۔.......

ہمارے خیال میں، ایک مدت تک رسول سے وحی منقطع ہوجانے کی حکمتوں کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے..... اس وقفہ کے دوران آپؐ کے بس میں یہ بات تو بہر حال تھی کہ غار کی وحی کی

تلقین کردہ پانچ آیتوں کی روشنی میں اپنی زندگی کے ایام گذاریں۔

یہ آیتیں اتنی بڑی ہیں کہ، ہیں تو ان میں بس چند کلمات مگر یہ معانی و رموز کا خزانہ اپنے اندر سمیٹے ہوئی ہیں۔ ان آیات نے اہل قریش کے تعلق سے بات شروع نہیں کی، نہ اہلِ عرب کے تعلق سے .... بلکہ انسان کے تعلق سے بات شروع کی۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ — انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔

محسوس ہوتا ہے گویا آپؐ کی رسالت کی بہت دُور اور کشادہ سرحدوں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے چنانچہ حقیقت بھی یہی ہے ——— آپؐ صرف اہل قریش کے لئے نہ تھے، صرف اہل عرب کے لئے نہ تھے، بلکہ آپ تمام لوگوں اور پوری نوعِ انسانیت کے لئے تھے۔

چنانچہ آپؐ انسانوں اور انسانی زندگی سے متعلق تمام امور میں اپنے اندر صبر و تحمّل اور مجرد یقین کا ایک انبوہ سمیٹے نظر آتے ہیں ..... یہ وہ اہم اوصاف ہیں جن کا ذکر بعد میں خود قرآنی الفاظ بار بار کرنے والے ہیں کہ:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ، وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ	(قلم) اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہو، اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جب اُس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (دہر: ۲۴)	لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو اور ان میں سے کسی بد عمل یا منکرِ حق کی بات نہ مانو۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ، لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ٥ (بنی اسرائیل: ۷۴)

اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔

ہاں! ابھی سلسلۂ وحی منقطع رہنے کے دوران، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملا کہ صبر، تحمل اور یقینِ مجرّد سے مالا مال ہولیں۔

ایک بار منقطع ہو کر گویا وحی یہ چاہتی تھی کہ آپؐ اس کے مقاصد اور اس کی مشکل راہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دے۔

جن لوگوں کے دل اللہ کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنی زندگی کو ذات پاک کے حوالہ کر دیا ہو، ایسے لوگ اللہ کے ساتھ صبر کا معاملہ کرتے ہیں۔ یعنی رات دن کی عبادتوں کے ذریعے اس کی رضا حاصل کرنے کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں پھر اس کی راہ میں مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانے میں صبر کی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جو معاملہ ان کی طاقت سے حقیقتاً باہر ہوتا ہے، وہ ہے خود اللہ سے صبر کر لینا۔...... !!

یہیں سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی نبی، کوئی ولی اور کوئی پاکدامن و مقدس شخص جو عام حالاتِ زندگی کے مصائب و شدائد کو بخوبی برداشت کر لیتا ہو، ایسا ہو سکتا ہے کہ اس سے اللہ کی محبت یا اللہ سے اس کی محبّت کی نعمت چھن جائے اور وہ اس کو برداشت کر لے۔؟

اس طرح جب ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ خود اللہ کی ذات سے صبر کر لینا ہر مقدس شخص بلکہ ہر نبی کی طاقت سے باہر کا معاملہ ہے۔ تو پھر بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک شخص نے وحی سننے، محسوس کرنے اور اس کے رعب دار مناظر دیکھنے کا لطف حاصل کیا ہو اور اس وحی نے اس کو اللہ کے ساتھ جوڑا

ہو وہ اس بات کو برداشت کرتے ؟ یہ کیسی بات ہوتی کہ ایک شخص کے پاس اللہ نے وحی اور ایک سفیر کو بھیجا جس نے اس کا نام لے لے کر برکت کی دعا دی، اللہ کا سلام ان تک پہونچایا اور اس کی رضا مندی کی خبر سنائی، پھر اچانک ملاقات کے محض ایک وعدہ کے ساتھ یہ سارا سلسلہ منقطع ہو گیا... ؟؟

یہ ایک ایسی مہلت تھی جو دوبارہ پھر کبھی ملنے والی نہ تھی تاکہ رسولؐ کی رُوح اور شخصیت کے اندر صبر و تحمل اور مجرّد یقین کی وہ بیش از بیش قوت، جو انسانی ادراک کے اندر ہو اور جو باہر ہے، سب کی سب پیوست ہو جائے۔

جہاں تک صبر و تحمل کا سوال ہے، ذرا غور تو کرو کہ زمانہ کا ایک لمحہ ایسا آیا کہ — اس شخص کی داہنی جانب کی فضا آفتاب سے معمور ہے، اور ماہتاب نے اس کے بائیں حصّے کی فضا کو چکا چوند کر رکھا ہے..... پھر اچانک یہ دونوں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں.... اور اب تنہائی و حیرانی کے سوا اس شخص کا کوئی ساتھی نہیں ہے.... اس کے سامنے صبر کے سوا اور کون سا راستہ رہ گیا ہے جب تک یہ مہلت ختم نہ ہو لے، جبکہ اس مہلت کا ختم ہونا اور وقت موعود کا آنا طے شدہ ہے۔ لیکن ان کو تو اس جیسے تجربہ پر صبر و تحمل اختیار کرنا ہی تھا۔ ایسے صبر کی مشق کرنا ضروری تھا جس سے اب تک دنیا آشنا نہ تھی۔.... !!

رہا مجرّد یقین ..... ہر پہلو سے اپنے رب پر مجرّد یقین رکھنا، یہاں تک کہ یہ تمام پہلو یقین کا مسکن بن جائیں اور اس کے عکس کو بکھیریں..... تو بس یہاں بھی ان کو وہ صحت مندی ملی جو آج تک کسی حق پرست اور عابد کے وہم و گمان میں بھی نہ گذری ہو —— دیکھو کہ اللہ کی وحی اس شخص کی زیارت کرتی ہے اور اس سے اس کی آیات پڑھواتی ہے اور کہتی ہے کہ: تم اللہ کے رسولؐ ہو اور میں جبریلؑ ہوں —— یہ واقعہ ہوتے ہی پھر وہ وحی چل دیتی ہے اور ایسی جاتی

ہے کہ شاید اب دوبارہ واپس آنے والی نہیں ہے یا گویا کبھی آئی ہی نہ تھی۔ اس طرح ایک طویل مدت کے لئے منقطع ہو جاتی ہے اور اس کے دوبارہ آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے۔ ....

کیا رسولؐ کے اندر ہر پہلو سے یقین پیدا کرنے اور رب العالمین و ذات الیقین پر قطعاً اعتماد جمانے کے لئے اس سے بہتر اور موزوں موقع کوئی اور ہو سکتا تھا .... ؟؟

ہاں، وحی کا منقطع ہونا یہ مطلب رکھتا تھا کہ .... گویا وہ رسولؐ کو کہہ رہی ہو کہ وحی آئے گی یا نہیں آئے گی ....

وہ تم سے ایک مدت کے لئے رخصت ہوئی ہو یا ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی ہو .... یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو سراسر اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے، بالکلیہ اسی کے اختیار میں ہے ...... رہا تمہارا سوال، تو تم عبادت اور حق پرستی پر قائم رہو ..... تمہارا یقین اپنی اطاعت کیشی اور یکسوئی پر قائم رہے .... اور تمہاری روح آسمانِ عبودیت میں خالص طور پر سرگرداں رہے ......

ایک لفظ میں یہ کہ ..... تم اپنی جگہ پڑے رہو اور اللہ سے ذاتِ خدا کے سوا کچھ طلب نہ کرو ...... !!

اللہ کے رسولؐ اس تجربہ سے بڑی کامیابی کے ساتھ گذرے، اس کے لئے آپؐ نے وہ ساری طاقتیں صَرف کیں جو کسی انسان کے بس میں ہو سکتی ہیں ______ مشقتیں اٹھا کر سینے میں ابھرنے والی بے قراری کو انگیز کئے رہے اور اپنے اندر صبر و تحمل کی قوتوں کو اسطرح سہارا دیئے رہے کہ حوصلہ مند رسولوں کے سوا یہ کسی کے بس کی بات نہ تھی .....

ایک وقت آئے گا جب آپؐ پر زبردست خوشی کی آوازوں میں وحی اترے گی اور

ایک مبارک سفر کا آغاز کراتی ہوئی آکر ربِ بزرگ و برتر کا فرمان ان الفاظ میں پہونچا گئی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم	اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانیوالا ہے
نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ	نٓ۔ قسم ہے قلم کی اور چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔
مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ	تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ	اور بیشک تمہارے لئے ایک ایسا اجر ہے جسکا سلسلہ کبھی ختم ہونیوالا نہیں ہے
مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى	اور بے شک تم اخلاق کے بڑے
خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ (سورہ قلم)	مرتبے پر ہو۔

یہ وحی آئی اور بس "محمدؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کامیاب ہو گئے، ایک زبردست کامرانی سے ہمکنار ہو گئے۔

اللہ کے رسولؐ کامیابی پا گئے، وحی آپؐ کے لئے ایک نہایت پاکیزہ اور ممتاز تاج لئے مخاطب ہوئی۔:

وَاِنَّكَ لَاَجْرًا غَيْرَ	اور بیشک تمہارے لئے ایک ایسا
مَمْنُوْنٍ	اجر ہے، جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونیوالا نہیں ہے
وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ	اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو

کیا ہم اس رونق و جلال کا تصور بھی کر سکتے ہیں جس میں آسمان اپنے نبیؐ و رسول کے لئے ڈوبا ہوا تھا؟ کیوں کہ ایک طویل بے قراری، گومگو اور زبردست صبر کے بعد آپؐ کے متعلق خداوندِ برتر کی ندا آئی تھی کہ "لو" یہ پھر اب سے تمہارے ساتھ ہے اور ہمیشہ ساتھ رہے گی، اے بلند اخلاق و خصائل والے .... ؟؟!!

مبارک ہو آپؐ کو، اے ابوالقاسمؐ، وہ چیز جو آپؐ کو دی گئی اور جب کے آپؐ اہل قرار دیئے گئے..... اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کی امت کو بھی مبارک ہو۔

یہ وقت ہے کہ اللہ کی وحی اور اس کا سفر آپؐ کے ساتھ ہے..... آج کے بعد پھر کبھی آپؐ کو اس کی تلاش میں نظر اٹھا اٹھا کر دیکھنا نہیں ہوگا..... اب وہ اپنے رب کے اِذن سے تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ اب وہ برابر تمہارے قلب پر نور اور فرقان (کسوٹی) لئے اترا کریگا

پھر اس کے بعد ہی وہ تم کو سنائے گا:

یَآاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ.......	اے اوڑھ لپٹ کر سونے والے
قُمِ الَّیْلَ اِلَّاقَلِیْلًا	رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو، مگر کم۔
نِصْفَهٗ اَوِنْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا	آدھی رات یا اس سے کچھ کم کرلو،
اَوْزِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ	یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور
تَرْتِیْلًا ۝ (مزمل)	قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔

اور پھر اس کے بعد ہی آپؐ کے پاس بعثت ورسالت اور ذمہ داری دیئے جانے کا اعلان آئے گا کہ:

یَآاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ	اے اوڑھ لپٹ کر لیٹنے والے
قُمْ فَاَنْذِرْ.....	اٹھو اور خبردار کرو۔

پھر یہ فرشتہ پے درپے صبح وشام پہونچے گا۔ آسمان وزمین کے درمیان.... اور اللہ و رسولؐ کے درمیان۔

اب یہ آپؐ کے ساتھ تیئس ۲۳ سال تک رہے گا۔

اب آپ اپنے رب کی مدد اور اپنے خلیل کی صحبت سے محروم نہیں رہیں گے۔

اس کے بعد یہ نعمت آپ کے لئے پوری کر دی جائے گی ...... اور خود آپ کی ذات پر پوری کی جائے گی۔

اے ابوالقاسم .....

عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا نوازے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔......

یومِ طائف

وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ

اور صبر اختیار کرو یہاں تک

اللہ خود فیصلہ فرما دے

(سورۃ یونس : ۱۰۹)

○ وحی نے آپؐ کو دم لینے کے لئے چھوڑ نہیں دیا۔ سلسلہ منقطع رہنے کی مدت ختم ہو کر جب وحی کے ساتھ آپؐ کی از سرِ نو ملاقات ہوئی تو اس کے بعد آپؐ اپنے مکان پہ ہانپتے ہوئے تشریف لائے، تاخیر کے بعد وحی آ کر پھر آپؐ سے ملی۔ اور آپ کو پکارا کہ اپنی کملی کے اندر سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوں۔:

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ — اے کملی میں لپٹنے والے

قُمْ فَأَنْذِرْ — اٹھو اور ڈراؤ۔

آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے ..... اس بار وہ گومگو کی کیفیت اس عظیم ذمہ داری کے سلسلے میں پیدا نہیں ہوئی جو آپؐ کے سپرد کی گئی تھی جس کے متعلق وحی پہلے دن آئی تھی، پھر کل آئی تھی پھر آج آئی......

قُمْ فَأَنْذِرْ — اٹھو اور ڈراؤ

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ — اور اپنے رب کی کبریائی بیان کرو

یہاں سے آپؐ اللہ کے رسولؐ اور خاتم النبیینؐ بن گئے......

اب آپؐ وحی کے رسول تھے جس کی خبر انبیاء دیتے آئے تھے، جس کے متعلق کتابیں کہتی رہی تھیں اور زمانہ جس کا منتظر تھا۔

اب آپؐ کو اپنے رب کے سہارے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بن کر اٹھنا ہے اور اس حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بن کر کام کرنا ہے۔

چنانچہ آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے ..... اور اللہ کی رضا کے لئے اپنے رُخ اور قلب کو یعنی ظاہر و باطن کو یکسوئی کے ساتھ اطاعت کیشی پر لگا دیا۔

اس کے بعد پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ اللہ کی رضا جوئی کے لئے لوگوں کو دعوت دینے لگے، اس مہم میں آپ کے ساتھ جو چیز نمایاں طور پر مہمیز کا کام کرتی رہی، وہ آپ کے اخلاق وادصاف شخصیت کی عظمت اور صبر واستقامت کا اثاثہ تھا، آپ نے فرمایا :

" اے گروہِ قریش !

تمہارا کیا خیال ہے! اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ دشمن کا ایک گروہ گھاٹی میں پہونچ چکا ہے جو تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے، تو کیا سن کر تم میری بات کی تصدیق کرو گے .... ؟؟

سب بیک زبان پکار اٹھے :

" ہاں، ہاں، ہمیں آپ سے کبھی کسی غلط بیانی کا تجربہ نہیں ہوا"

" اچھا! تو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنایا گیا ہوں"

اتنا کہنا غضب ہوگیا اور اچانک حملہ کا جوش اُبھر گیا .....

غضب یوں کہ اکثریت کے لئے یہ الفاظ کڑوا گھونٹ تھے۔ اور حملہ کا جوش یوں کہ ابولہب پر شیخی اور جہالت میں اپنی بڑائی کا نشہ چڑھ گیا۔ !!

یہ تھے مقدس لمحات۔ یہاں سے قافلۂ اسلام کا سفر شروع ہوا۔ تھوڑے وقفہ سے، مگر تیزی کے ساتھ اس قافلہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اب یہ نیا پودا جڑ بھی پکڑنے لگا اور تناور بھی ہونے لگا۔

اس قافلہ میں سبقت کا مقام حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور زیدؓ بن حارثہ کو حاصل ہوا، پھر جلد ہی عثمانؓ ابن عفان، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام، طلحہؓ بن عبید اللہ

عبد الرحمٰن بن عوفؓ، بلالؓ، خبابؓ، ابن مسعودؓ، عمارؓ، یاسرؓ، سمیہؓ، سعد بن زیدؓ، فاطمہ بنت الخطابؓ اور مصعب بن عمیرؓ جیسے حضرات بھی شامل ہو گئے۔

ہدایت نے اپنے متلاشیوں کو آواز دی۔ لوگ اپنے سامنے بلند نصب العین کو گلے لگائے ہوئے ہدایت کی طرف آگے بڑھنے لگے اور اللہ کے جھنڈے تلے اس کے رسولؐ کے گرد جمع ہوتے رہے۔

حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر کا دروازہ کھل جاتا ہے اور پوشیدہ طور پر آگے بڑھنے والے اس مبارک گروہ کو گمراہ لوگوں کی چالوں سے بچا لینے کے لئے، ان کا استقبال کرتا ہے۔

ادھر قریش کی ذہانت نے بھانپ لیا کہ نرم گوشہ مہیا کر کے پردہ داری کرنے والے اس گھر سے ان پر اور ان کے معبودوں پر ایک زبردست خطرہ لاحق ہو کر رہے گا۔

ان کی عظمت پر جو ضرب لگی تھی وہ اب سڑے ہوئے زخم کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ چنانچہ خود اس کی سوزش، اس دشمنی کی آگ، اس دو آتشہ کا اثر یہ تھا کہ اب وہ اس روشنی سے دور ہٹ کر زبان نکالے ہانپ رہے تھے۔

اِدھر ایمان والوں کا یہ حال تھا کہ اپنی قلتِ تعداد کے باوجود بے نیاز سے ہو گئے تھے۔ ان کی یہ بے نیازی اور ثابت قدمی اہل قریش کے اوپر ذلت کی ایک ایسی چادر ڈالتی جا رہی تھی کہ وہ ایسی ذلت کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اب ان پر جنون سوار ہو رہا تھا، چنانچہ وہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے قبضے میں دے دیجئے، اس کے عِوَض قریش کے جس جیالے اور خوبرو کو چاہیں، لے لیں۔ ابو طالب ان کے جنون کو تاڑ گئے۔ تمسخر کے انداز میں افسوس ظاہر کرتے ہوئے بولے:

"کیا تم مجھے اپنا بیٹا دیتے ہو کہ میں اس کو کھلا پلا کر پرورش

کردں، اور خود اپنے بیٹے کو میں تمہارے حوالہ کر دوں کہ تم اس کو قتل کر ڈالو......؟!"

چچا ڈٹے رہے، اور آپؐ کی اہلیہ بھی ڈٹی رہیں..... حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ دونوں حضورؐ کے پشت پناہ رہے۔ حضرت خدیجہؓ اپنے تمام اثر و رسوخ کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں استعمال کرتی رہیں۔

بت پرستی اپنی جائے قرار سے محروم ہونے لگی۔ آخر کار اس نے ایک سخت عہد و پیمان عمل میں لانے کے لئے آواز دی تاکہ تمام بنی ہاشم کا مقاطعہ کر دیا جائے۔ ان کو سماجی زندگی اور جماعت سے برطرف کر کے، نہایت وحشت ناک تنہائی و ویرانی کی حالت میں ڈال دیا جائے۔

اہل ایمان پر درپردہ مصیبتوں کے پہاڑ توڑنے کی کارروائی میں انھوں نے ذی وجاہت اور تہی دامن لوگوں کے درمیان کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بے چارے غریبوں کے حصے میں جو تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی وہ بھی پوری کر دی گئی۔

لیکن وہیں...... "اللہ کے رسولؐ" اس آندھی کے رُخ پر اور بھیانک چنگھاڑ کے مقابلے میں بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑے مسکراتے رہے۔ آپؐ خود اپنے کاندھے سے اور اپنے ساتھیوں کے کاندھوں سے بھی قریش کی ڈالی ہوئی گرد و غبار کو سکون و وقار کے ساتھ جھاڑ رہے تھے۔

مضبوط ارادوں کا اظہار کرنے والی آپؐ کی امید افزا مسکراہٹیں آپؐ کے گرد جمع ہونیوالوں کے دلوں میں امن و سکون اور آسودگی کی تہیں جماتی جا رہی تھیں۔

آپؐ اپنی شہادت کی انگلیوں سے سامنے کے کسی تنکے کی طرف اشارہ فرماتے، تو آپؐ کے اصحاب کے قلب و جگر میں مصائب و خطرات کی آخری حدود سے بھی آگے چلے جانے کی جرأت بلند سے بلند تر ہو جاتی تھی۔

وہ لوگ ان اشاروں کو خوب پہچانتے تھے۔ اس بات پر ان کا ایمان بہت پختہ تھا کہ ان اشاروں کا مطلب ہے۔ :

"کوئی حرج نہیں ..... صبر کا دامن تھامے رہو ... کل کامیابی یقینی ہے ...... اور کل کے بعد پرسوں جنت اس سے زیادہ یقینی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان صبر و ثبات کے پیکر بنے رہے۔

لیکن ذات سراپائے رحمت پر اپنے اصحاب کی یہ اذیتیں شاق گذر رہی تھیں ___ آپؐ پر پاکیزہ اور بہترین درود و سلام ہو ___ آپؐ خود اپنی مصیبتیں تو انگیز کرتے رہے تھے لیکن اہل ایمان پر ڈھائی جانے والی اذیتیں آپؐ کے لئے سوہانِ روح بن رہی تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے ان کو ہجرت کر کے حبشہ چلے جانے کا حکم دے دیا اور خود اس بات پر راضی رہے کہ تنہا اہل قریش کا نشانہ بنے رہیں، جبکہ اہل قریش کا حال یہ تھا کہ اپنے سینوں میں سلگنے والی کینے کی چنگاریوں کی للکار پر وہ خود کو رضا کارانہ طور پر سپرد کر چکے تھے۔

اور ایک سال ....

اُس سال، جو بڑے اہم حادثہ کا سال تھا، جس کو " عام الحُزن" یعنی غم کا سال کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیارے، بہت چاہنے والے چچا حضرت ابو طالب سے اور خود اپنی وفا شعار شریکۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے محروم ہو گئے۔

اپنے چچا سے محروم ہونے کا مطلب تھا اس شخص سے محروم ہو جانا جو آپؐ کے لئے ڈھال بنے رہے اور جس نے آپؐ کی خاطر قربانیاں دیں جس طرح یکا و تنہا ہو کر کوئی شخص حمایت کرتے ہوئے

قربانیاں دے سکتا ہے۔

اور اپنی اہلیہ سے محروم ہو جانے کا مفہوم یہ تھا کہ آپ اس ذات سے محروم ہو گئے جو اپنی ایمان داری، خوش اخلاقی اور اثر و رسوخ کے ذریعے آپؐ کی مددگار بنی رہی۔

اہل قریش کے لئے اب فضا پہلے سے بہت زیادہ سازگار ہو چکی تھی۔ چنانچہ مختارِ ایزدی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر لوگوں نے اپنی احمقانہ سخت کلامیاں تیز کر دیں۔ ان کو ذرا شرم نہ آتی تھی کہ اتنے اوچھے اور گھٹیا انداز میں یہ توہین آمیز حرکتیں وہ اس شخص کے خلاف کر رہے ہیں جس کی بڑائی و برتری کی خوشبو سے خود وہ معطّر ہو رہے تھے اور جس کے معاملات کم عمری ہی سے ایسے تھے گویا کہ وہ ان کا امیر و سردار ہو ..... !!

ذرا دیکھو تو، یہ قوم کیسی نادانیوں پر اتر آئی کہ ان کے بعض احمقوں نے گرد اور جانوروں کی لید تک آپؐ پر ڈالی، اس ذلیل رویّہ کو دیکھ کر آپؐ کی دخترِ عالی مرتبہ "فاطمہ زہراؓ" روتی جاتیں اور جھک کر آپؐ کی چادرِ مبارک کی آلائشوں کو دھو کر صاف کرتی جاتیں۔

آپؐ منتخبِ دو جہان سراپائے خیر بڑے صبر کے ساتھ اپنے نرم ہاتھوں سے بیٹی کے آنسو پونچھتے جا رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ :

"بیٹی ! گھبراؤ نہیں

یقیناً اللہ تمہارے باپ کی مدافعت کرے گا ...... !!

آپؐ کو ہر لحہ اس بات کا یقین تھا کہ اللہ آپؐ کی مدافعت و حفاظت ضرور فرمائے گا ....

یہی سبب ہے کہ آپؐ نے اپنے جسمِ اطہر کو چھوڑ دیا تھا کہ جتنا جی چاہے، لوگ اس پر عذاب ڈھا لیں ..... لیکن جہاں تک معاملہ آپؐ کی رُوح کا تھا، تو اگر لوگ اس پوری زمین کے برابر بھی

سختیوں، عداوتوں اور جبر و سرکشی آپؐ پر کر ڈالیں، پھر بھی اس پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔!

چنانچہ ـــــ اس وقت آپؐ کی شانِ اولوالعزم انبیاء کی شان تھی ـــــ آپؐ نے جور وظلم کے مقابلے میں محض صبر پر اکتفا نہیں فرمایا...... بلکہ آپ عملاً اس سے بھی آگے بڑھ گئے جس راستہ میں انھوں نے لوگوں کو آپؐ کی گھات میں بٹھار کھا تھا اور خوف وخطر کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ اس راستے پر آپؐ بے دھڑک بڑھتے رہے.... !!

ایک دن آپؐ اپنی دعوت پر نئے ایمان لانے والوں کی تلاش میں نکلے۔ یہ وہ وقت تھا کہ تنہا پاکر آپؐ کی جان کے لئے خطرہ پیدا کرنے والی فضا میں، جو قریش کے لوگوں نے برپا کر رکھی تھی، اس سے بچنے کے لئے ضرورت تھی کہ تنگیوں میں مبتلا اپنی جان کو کچھ آرام اور ذہن کو کچھ سوچ بچار کرنے کا موقع دیتے......

مگر آپؐ نے طائف جانے کے لئے سامان تیار کر لیا......

وہ بھی ایک عجیب دن تھا .... !!!

اس مثالی دن کے حالات واشارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پر اس دن کیسے کیسے واقعات اور حادثات گذرے ہوں گے۔ کیوں کہ حضرت ابو طالب کے انتقال کے بعد اہل قریش اپنی عداوت کی آگ بجھانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اذیتوں و مصیبتوں کا پہاڑ توڑنے کے لئے شیر کی طرح دھاڑنے لگے تھے۔ اس حقیقت کی تصویر خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کھینچی ہے..... :

" حضرت ابو طالب کی وفات تک اہلِ قریش میرے ساتھ وہ

ناروا برتاؤ نہ کرسکے جو مجھ پر شاق گذرتا۔"

آپؐ نے طائف کا سفر کیا تاکہ ثقیف کے لوگوں تک اللہ کا کلمہ پہونچا دیں کہ اگر وہ اسلام لے آئے تو اہل قریش کے جنون کے مقابلے میں پشت پناہ ثابت ہوں گے۔

آپؐ نے مایوسی کو بالائے طاق رکھا۔ آپ کے عمل اور ثابت قدمی سے یہ بات واضح بھی ہوگئی آپؐ نورِ یقین سے سرشار اس مہم پر روانہ ہوگئے جس کو انجام دینے کے لئے اللہ نے آپؐ کو منتخب فرمایا تھا۔ حادثات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی آپؐ اپنے جادہ و منزل کو سامنے رکھتے۔

بڑی بنیادیں استوار کرنے والے انسان محض اپنی عملی جد وجہد میں شجاعت کا مظاہرہ نہیں کیا کرتے، بلکہ امیدیں باندھنے اور بڑے بڑے خواب دیکھنے کے لحاظ سے بھی وہ بڑے بیباک ہوتے ہیں بالخصوص جبکہ وہ انبیاء و رسل ہوں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی نہج پر اپنے سامنے حائل تمام مشکلات اور مایوسیوں کو اپنی امیدوں اور خوابوں کے ذریعے پاش پاش کر دیتے ہیں۔

جب آپؐ اپنے خاندان و برادری کے لوگوں اور خوب پہچاننے والوں کو دیکھ رہے تھے کہ آپؐ کا صدق و امانت، آپؐ کے اوصاف و خصائل اور اپنے راستہ پر آپؐ کی ثابت قدمی ان کے سامنے تھی، ..... پھر بھی وہ آپؐ کو جھٹلا رہے تھے اور آپؐ کے خلاف آمادۂ پیکار تھے اس کے باوجود آپؐ ایسی کسی منطق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے جو یہ کہے کہ:

"جب قریبی اور خوب پہچاننے والوں کا یہ حال ہے تو..... بھلا دوسرے لوگوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے.....؟"

باوجودیکہ ایسے وسوسوں کے بہت سے مواقع آئے، مگر آپؐ نے ایسی کسی منطق کو راہ نہ دی

بلکہ اس کے برخلاف، آپؐ کی امیدوں اور خوابوں کا سلسلہ دور دور، تمام آفاق تک وسیع ہوتا چلا گیا، حالاں کہ کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں ملی، نہ کسی فیاضانہ برتاؤ کا اظہار ہوا۔

ہاں .... مگر ایسا کیوں ..... اس لئے کہ آپؐ رسول تھے، آپؐ کی ذمہ داری بس بات پہونچا دینے کی تھی :

"تم تو صرف ہوشیار و چوکنا کرنے والے ہو" !!

"اور ہر قوم کے لئے کوئی نہ کوئی راہ بتانے والا ضرور آیا"۔

یہ تھے وہ جذبات جس کے ساتھ آپؐ طائف پہونچے .... وہاں آپؐ نے سرداروں اور رئیسوں میں سے تین اشخاص[1] سے اپنے مشن کا آغاز کیا۔ توقع تھی کہ ـــــ اگر اللہ نے ان کو اپنے دین کی توفیق بخشی تو ـــــ وہ بشیر و بن جائیں گے اور ثقیف کے بقیہ لوگ ان کے پیچھے ہولیں گے۔

یہ تینوں آدمی آپس میں بھائی تھے۔ یہ لوگ بڑے سنگدل ثابت ہوئے۔ یہ عمرو بن عمیر کے بیٹے تھے۔ اللہ کے رسولؐ ان کے پاس گئے اور ہدایت کی دعوت پیش فرمائی، ایمان کی باتیں کیں اور ان کو خوشخبری سنائی کہ اگر وہ لوگ آپؐ کے حامی و مددگار بن جائیں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کر لیں جو آپؐ کے ساتھ اتاری گئی ہے، تو اللہ ان کے لئے پناہ بن جائے گا اور اس کی خوشنودی ان کو حاصل ہو جائے گی لیکن یہ باتیں ان پتھر سے زیادہ سخت دلوں پر نہایت گراں گذریں۔ ان سنگدلوں نے جو کچھ سنا اس کے خلاف بغض و عداوت پر اکتفا نہیں کیا

---

[1] عبد یالیل، مسعود اور حبیب ان کے نام تھے (مترجم)

بلکہ وہ عداوت کی حد سے آگے بڑھ کر مذاق اڑانے لگے، کچھ اپنے لوگوں میں سے اور کچھ غلاموں میں سے نادان اور اوباش لوگوں کو اکسا دیا کہ آپؐ کی ذاتِ کریمہ کے ساتھ افسوسناک حد تک بُرا سلوک کریں۔

اجنبی مہمانوں کے ساتھ اکرام کے عام عربی اخلاق کو بھی ثقیف کے ان سرداروں نے بالائے طاق رکھ دیا..... !!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کا جواب ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا:

"کیا اللہ کو تمہارے سوا اور کوئی نہ ملا تھا جس کو وہ رسول بنا کر بھیجتا"...... !!

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے اوباشوں اور غلاموں کو بلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا کہ وہ آپؐ کو گالیاں دیں اور آپؐ پر آوازے کسیں .... اور اس کریم الاخلاق اور امام الانبیاءؑ پر ڈھیلے اور سنگریزے پھینکیں .... !!!

آپؐ کے ساتھ حقارت و پستی اور کمینہ پن کا یہ رویہ اختیار کیا گیا مگر آپؐ اس سے ذرہ برابر دل برداشتہ نہ ہوئے۔ البتہ آپؐ کو جس تلخ بات کا اندیشہ تھا وہ یہ تھی کہ طائف میں ثقیف کے لوگوں نے آپؐ کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کی خبر جب اہل قریش کو ملے گی تو اس سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا اور پھر ان کی بدسلوکی بڑھ جائے گی۔

آپؐ چلتے رہے اور آپؐ پر نادانوں کے شور مچانے اور بھونکنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک باغ کے قریب پہونچے۔ یہاں آکر آپؐ نے ذرا دم لیا۔ اور اس خون کو خشک کرتے رہے

جو نادانوں کے پتھر مارنے کے نتیجے میں آپؐ کی دونوں ایڑیوں سے جاری تھا۔

آپؐ کو ذرا سکون میسر آیا۔ اس جگہ پر آپؐ کا دل بھر آیا اور آنکھیں اشک بار ہو گئیں .... !!

جب سے آپؐ نے دنیا میں آنکھیں کھولیں، تب سے آج تک، اڑتالیس سال کی عمر آپؐ نے لوگوں کے درمیان محبت اور عزت و احترام کے ایسے ماحول میں بسر کی گویا یہ مجلسِ جشن کے لمحات تھے .... لیکن ایک آج کا دن تھا، کہ آپؐ پر جو کچھ بیتنا تھا وہ بیت گیا۔

سب سہی، مگر یہ سختی کیا تھی ؟ اللہ کی راہ میں آپؐ کو اس سے کئی گنا بڑی سختیوں سے سابقہ پیش آنے والا تھا .... ؟؟

اس سے بڑھ کر شرف کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ آپؐ کو جن مصیبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ محض اس سبب سے آ رہی تھیں کہ آپؐ اس زمین پر، پرچمِ حق بلند کرنا چاہتے تھے اور خیر و ہدایت کا نشان نمایاں کر دینے کے لئے سرگرداں تھے ....

اور پھر عظمتِ حیات کو پانے کے لئے زبردست رنج و الم سے گذرنے کے سوا اور کیا صورت ہو سکتی ہے .... ؟؟

اس باغ[1] میں آپؐ نے ایک درخت سے پیٹھ ٹیک دی اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اپنے رب سے گڑگڑا کر مناجات فرمانے لگے :

" اے میرے اللہ ! میں تیرے ہی حضور میں اپنی بے بسی بے چارگی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی بے قدری کا شکوہ پیش کرتا ہوں۔

---

[1] یا باغ کی دیوار

"اے ارحم الراحمین! اے ناتوانوں کے پروردگار! جبکہ
میرا رب بھی تو ہی ہے، تو پھر مجھے تو کس کے سہارے پر
چھوڑتا ہے؟...... کیا کسی بیگانے کے سہارے پر؟
یا کسی دشمن قوم کے حوالہ کر رہا ہے جو مجھ پر اپنا قابو چلائے؟
"اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پروا
نہیں!! بلکہ تیری عافیت اگر مل جائے تو میرے لئے
بہت کشادہ ہو......
"میں تیرے رُخِ منوّر کے نور کی پناہ چاہتا ہوں، جس
سے تاریکیاں چھٹتی ہیں۔
اور جس پر دنیا و آخرت کے معاملے کے درست ہونے کا
دار و مدار ہے ــــ اس بات سے پناہ کہ مجھ پر تیرا غضب
نازل ہو یا مجھ کو تیرا عتاب آ دبوچے!
"طلب بس تیری رضامندی کی ہے، یہاں تک کہ راضی ہو جائے
"اور طاقت و قوت جو کچھ ہے، وہ سب بس تیرے
ہی دَم سے ہے...!!

دنیا سے یہ عظیم الشان بے نیازی دراصل ایک جلیل القدر رُوح ہی کے شایانِ شان تھی۔
یہ خدا کی طرف رجوع کرنے والے رسولؐ کی التجائیہ پکار تھی جس نے اللہ کی قدر و منزلت
کا پاس و لحاظ رکھنے کا حق ادا کر دیا۔ اور اپنی باطنی و ظاہری توجہات کو، بلکہ اپنے پُورے وجود کو

اُس کی مشیت و رضا کے سپرد کر دیا۔

" اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے، تو پھر مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔

لیکن اس خیال سے کہ کہیں ان الفاظ سے زورِ قوت، قدرت و بے نیازی اور تحمل کے پندار کا فریب نہ ظاہر ہو، فوراً آپؐ دوسرے کلمات کے ذریعے وضاحت فرما دیتے ہیں، اپنی قوت کے بجائے خدا کی مجرد قوت و طاقت کا اظہار فرماتے ہیں..... اور اپنے رب کے لئے اپنی مطلق عبودیت و بندگی کا اور اپنی تمام حاجتوں کو مطلقاً اللہ کی قوت و طاقت کے حوالہ کرنے کا اقرار کرتے ہیں....

" بلکہ تیری عافیت اگر مل جائے تو میرے لئے بہت کشادہ ہو"

اللہ اکبر، دیکھو! کیسا سکونِ نفس، کیسی طمانیتِ روح اور..... کس قسم کی ذکاوتِ قلب ابھرتی نظر آتی ہے....... ایسے کرب انگیز، مایوس کن اور سخت حالات میں.... ؟؟ !!!

" طلب بس تیری رضامندی کی ہے یہاں تک کہ راضی ہو جائے"

" اور طاقت و قوت جو کچھ ہے، سب بس تیرے ہی دم سے ہے"

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر قدرت نے آپؐ کو سختی اور تنگی کے اس انتہائی مقام پر لا کر کیوں چھوڑا..... ؟

بڑی شخصیتوں کے لئے معمولی توہین بھی ایسی تیز سوزش پیدا کرنے والی اور بوجھل ہوتی ہے کہ کوئی دوسری چیز اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو سکتی۔

بڑی شخصیتیں، بڑے بڑے رنج و الم کو نہایت دلجمعی اور پامردی کے ساتھ سہ لیتی ہیں خواہ کیسے ہی سخت اور تکلیف دہ ہوں۔ لیکن ایک معمولی توہین جس سے شخصیت اور وقار مجروح

ہو، عموماً قوتِ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مناجات کو پڑھتے ہیں جو ابھی قریب ہی ہماری نظروں سے گذری ہے، تو آپؐ کے ان الفاظ میں واضح طور پہ تلخی اور کڑواپن کا مزہ محسوس ہوتا ہے کہ :

"اور لوگوں کی نظروں میں اپنی بے قدری کا شکوہ پیش کرتا ہوں"۔

آخر اتنی سخت مشقت کے حال میں ذاتِ رسالت مآبؐ کو کیوں چھوڑ رکھا گیا....؟

یومِ طائف کا دراصل یہی عظیم سبق ہے۔

یہ وہ سبق ہے جو زندگی کو اور زندگی پانے والوں کو سکھاتا ہے کہ سچائی کے ساتھ بنیادی کام کرنے والوں کی مصیبتیں اور قربانیاں محض ان کاموں میں پیش رفت کا راستہ نہیں ہیں بلکہ ......

بلکہ یہ ان کاموں کی ریڑھ اور ان کا جوہرِ اصلی ہے۔

یہ درحقیقت اس کام کے کرنے والوں کی ذات اور اس کے اس کام کا جزو ہے۔ اور رنج والم اور قربانیوں کے بغیر اس کی حقیقت وافادیت نکھر کر سامنے نہیں آیا کرتی ہے....

پھر کارِ رسالت اور خود صاحبِ رسالت کا تعلق جس وطیرہ سے ہوتا ہے اس میں تو نوعیت اور کمیت دونوں اعتبار سے مصیبتوں اور قربانیوں سے سابقہ پیش آنا لازم وملزوم ہے.....

چنانچہ وحی کا یہی مفہوم تھا جب اس نے رسولؐ کو پکار کر کہا تھا کہ کمبل ہٹاؤ اور :

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (سورہ مدثر) اور اپنے رب کیلئے صبر اختیار کرو

یہ دو کلمے ہیں...... ان سے صاف ظاہر ہے کہ جتنی بھاری قربانی عنقریب آپؐ کو اس راہ میں دینی ہوگی اور اس کی تمام صورتوں کا بار اٹھانا ہوگا اس سے، پہلے ہی قوم کو آگاہ

کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد بھی وحی نے رسالت کے طویل دور میں اس نصیحت کو بار بار ذہن نشین کرایا کہ:

وَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ — تم صبر اختیار کرو (اور ڈرتے رہو) جس طرح

أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ — صاحب عزیمت (اور حوصلہ مند) رسولوں نے صبر کیا

ہاں، صاحبِ عزیمت، یعنی عام انسان صبر کے جس معیار سے مانوس ہیں اس سے اونچے معیار کے صبر کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔!!

اور صاحبِ عزیمت پیغمبروں کو جس کرب والم سے گذرنا پڑتا ہے، جواباً اس کا صلہ اور ہمدردانہ برتاؤ بھی ہمیشہ ان کو نہیں ملا کرتا ہے.... یعنی ایسا نہیں ہوا کرتا ہے کہ مخالفین اور دست درازوں کی جانب سے جو یہ مصیبتیں ڈھائی جاتی ہیں.... تو کم از کم رُوح کے وقار کو مجروح نہ کیا جائے خواہ جسم کو مبتلائے اذیت رکھا جائے،..... نہیں، ہمیشہ ہرگز ایسا نہیں ہوا کرتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو معمولی ہمدردانہ برتاؤ سے بھی محرومی ہی رہتی ہے۔ بالعموم یہ عداوت چھوٹی چھوٹی توہین آمیز صورتوں اور عام رنگ میں سامنے آئی ہیں۔ مثال کے طور پر زبان نکالنا ناک منہ بسوڑنا، برا بھلا کہنا اور مذاق اڑانا، اور نادانوں، بچوں اور بہکے ہوئے لوگوں کو پتھر مارنے، کیچڑ پھینکنے، شور مچانے، آوازے کسنے اور ناشائستہ حرکتیں کرنے پر اکسا دینا۔!!!

جو کچھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو طائف میں انگیز کرنا پڑا، یہ آپؐ کے لئے بطورِ سزا نہ تھا، اور نہ کسی قصور کے سبب نظر پھیر لینے کا نتیجہ تھا..... کیونکہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکہ سے نکل کر بنو ثقیف کے پاس جانے کی غرض یہ تھی کہ تبلیغی عمل اور اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے

اور ڈراتے رہنے کے حکم کی تعمیل کو جاری رکھا جائے۔

گویا اس صورتِ حال سے دوچار ہونے کے لئے چھوڑ دینا ______ محض نبوت کے ایک سبق اور قیادت کے ایک مشاہدے سے گذارنے کا منصوبہ تھا جس میں صدیوں تک جیالے لوگوں کے لئے زادِ سفر، طریقۂ عمل اور ہدایت کے سامان کا بندوبست تھا......

جس کسی شخص کو حق وہدایت اور ایمان کا جھنڈا اٹھانے کا شرف حاصل کرنے کی توفیق ملی ہو، اس کے لئے یہاں ایک سبق ہے وہ یہ کہ قربانی دینے کا جو بلند و مستحکم حوصلہ اس کے اندر کارفرما ہے، اس کو وہ نرم روی کے ساتھ کام میں لائے۔ پھر وہ یہ بھی خیال رکھے کہ خواہ اس پر کیسے ہی مصائب ڈھائے جائیں اور اسے کیسے ہی رنج ومحن میں ڈالا جائے، وہ بہرحال صبر و ہمت کا دامن مضبوطی سے تھامے رہے۔ ایسے تمام لوگوں کے لئے یہ ایک سبق ہے۔

پھر ایسے حالات میں کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک سچی ڈھارس بھی ہے، لوگ عداوت استہزار اور اہانت کا رویّہ اختیار کریں۔

اور یہ ان کو ہوشیار اور خبردار کرنے والی چیز بھی ہے کہ ان کو شخصی عظمت اور عقیدہ ومسلک کی برتری کا شرف حاصل ہے، اس کی بدولت وہ نفس گندا اور روح کو برانگیختہ کرنے والی اہانت آمیز اور ذلیل حرکتوں سے بچ نہیں سکیں گے..... !!!

جیسا کہ گذر چکا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے۔ اپنے رب سے اپنی کمزوری، قلتِ وسائل اور لوگوں کی نظروں میں بے وزنی کا شکوہ کرنے لگے۔ پھر اپنے پختہ عزم کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا:

" اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے ، تو پھر مجھے کسی بات
کی پروا نہیں ہے ۔"

اسی طرح اللہ کے لئے اپنے جذبۂ بندگی اور اس کی ذات پر کامل اعتماد کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا۔

" لیکن تیری عافیت میرے لئے بہت کشادہ ہے۔"

آپؐ کی اس کیفیت کو اس باغ کے دو مالک تھے جو دُور سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک غلام کو بلایا اور حکم دیا کہ ایک تھال میں انگور کا ایک بڑا سا خوشہ رکھ کر رسول اللہؐ کے پاس لے جاؤ اور ان کے سامنے رکھ دو۔

غلام جاتا ہے۔ اس کا نام "عداس" تھا اور وہ عیسائی تھا۔ وہ انگور کا تھال رسول اللہ صلّی اللہُ علیہ وسلم کے سامنے جا کر رکھ دیتا ہے۔

جذبۂ شکر سے لبریز تبسم ہونٹوں پر دوڑ جاتا ہے، اس کیفیت کے ساتھ رسولؐ اللہ اس پر نظر ڈالتے ہیں، اپنا داہنا ہاتھ انگور کے خوشے کی جانب بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں : بسم اللہ[1] ...!!
بسم اللہ کا کلمہ سنتے ہی وہ غلام حیرانی و گھبراہٹ میں پڑ گیا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یوں ہمکلام ہوا :

عداس :۔ خدا کی قسم ، یہ کلمہ تو اس خطے کے لوگ نہیں بولا کرتے ہیں۔

رسولؐ اللہ :۔ تو تم کس ملک کے باشندہ ہو ؟ اور کس دین کے ماننے

---

[1] یا پورا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فرمایا تھا (مترجم)

والے ہو؟

عداس:۔ میں عیسائی ہوں، نینوی کا باشندہ ہوں۔

رسول اللہؐ:۔ نیک بندے یونس بن متّی کی بستی کے ہو...؟؟

عداس:۔ یونس بن متّی کو آپ کیسے جانتے ہیں....؟

رسول اللہؐ:۔ وہ میرے بھائی ہیں وہ ایک نبی تھے اور میں بھی ویسا ہی ایک نبی ہوں۔

اس واقعہ کی تاریخی روایت بتلاتی ہے کہ، اس بات پر عداس رسول اللہؐ کی طرف جھک کر آپؐ کی پیشانی، ہاتھوں اور قدموں کا بوسہ لینے لگا !!

حکمتوں کی مالک قدرتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ اس بے نظیر منظر کو بھی یومِ طائف کا ایک اور بڑا سبق بنا دے۔ ایک مقصد کے تحت ایک انسانی نمونہ ایسا بھی پیش فرما دیا گیا جو آسمان سے منتخب ہو جانے کے بعد آگے چل کر زمین پر اُس کا "عَلَم" لے کر اٹھ کھڑا ہوگا۔

جس وقت اللہ کے رسولؐ طائف میں تشریف لائے تھے تو آپؐ نے ارادہ فرما لیا تھا کہ یہاں کے شُرفاء اور بڑے لوگوں کے کینوں اور عداوتوں کے مظاہرے کی صورت میں ان سے زیادہ ملنے جُلنے اور بیٹھ کر باتیں نہیں کریں گے بلکہ آپؐ نے ٹھان لیا تھا کہ کسی طرح آپؐ اپنے اور اس دعوت کے سلسلے میں ان کی اہمیت خود ان کو ذہن نشین کرائیں گے۔ چنانچہ آپؐ سب سے پہلے بنو ثقیف کے ایک رئیس کے دولت کدہ پر وارد ہوئے۔ مگر اس گھر کے لوگوں نے آپؐ کو سراسر ٹھکرانے اور رسوا کرنے کا رویّہ کیا۔

اس کے بعد جب آپؐ باغ کے پاس شدّت کی گرمی میں ذرا دَم لینے کے لئے تشریف فرما ہوئے

تاکہ آپؐ کے پیچھے جو شریر لوگ لگا دیئے گئے تھے، ان کے شور و شغب سے ذرا ذہنی سکون و عافیت میسر ہو۔ تو اس باغ کے دو مالکوں، عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے دل بھی آپؐ کی باتوں کو سننے اور آپؐ کی مہم کو سمجھنے کے لئے ذرا حرکت میں نہ آئے۔ یہ دونوں بھائی بھی اہل قریش اور اہل طائف دونوں کے درمیان عزت و مرتبہ والے لوگ تھے۔

مگر اچانک ...... اس تمسخر سے بھری گمراہی کی تہوں کے بیچ سے قدرت نے چھپا ہوا ایک زبردست جوہر ظاہر کیا۔ وہ ایک غریب مزدور نوجوان تھا جس کو قدر و منزلت حاصل تھی، نہ وہ کوئی اثر رکھتا تھا، نہ وہ کسی منصب پر فائز تھا۔ اس نے ایک لمحہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوئے انور کو پڑھ لیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اپنا دل، اپنا یقین، اپنی محبت اور ایمان سب کچھ رسولِ خداؐ کے سپرد کر دیا..... !!

جس طرح قدرت نے رسالت کے لئے انتخاب کیا تھا اور جس طرح اور اس کی بنیادیں استوار کر رکھی تھیں، اسی طرح قدرت کے یہاں ہر کام کا وقت بھی متعین ہے۔

ٹھیک جس لمحے ایک بیگانہ سرزمین انگور کے خوشے کی شکل میں نیکی و پاکیزگی کو آپؐ کے سامنے پیش کر رہی تھی، عین اسی لمحے آسمان آپؐ کی خدمت میں ایک عمدہ ہدیہ پیش کر رہا تھا، اس ایمان، محبت اور عظمت سے لبریز رُوح کی شکل میں..... !!

اور جن گھڑیوں میں زمین میں اپنی برائی کا سکہ جمانے والے لوگ آپؐ سے رُخ پھیر رہے تھے، اور ان کے نادان و کج فہم لوگ دھوکہ میں پڑے ہوئے تھے، عین اسی وقت قدرت نے "عداس" جیسے شخص کی شکل میں کشادہ دل اور مشقت برداشت کرنے والے لوگوں کو آگے بڑھایا جو آپؐ کی جماعت اور ہراول دستہ بن کر پیش قدمی کرنے والے بنے۔

جی ہاں ..... ایسی نازک گھڑی میں عداس کا ظہور دراصل آئندہ پیش آنے والے شاندار واقعات کی بنیاد ڈالنے کے مترادف تھا جس کو اسلام اور رسولِؐ اسلام کی تاریخ میں نمایاں طور پر نوٹ کیا جاتا تھا۔ اور اس کی حیثیت دراصل ایک عظیم فتح و نصرت کی تھی۔

ایسے موقع پر ان کا ظہور نوعِ انسانی میں سے اس دین اور اللہ کے رسولؐ کی حمایت کے لئے غیب کی جمع کردہ ایسی روحوں کو بروئے کار لانے کی ابتدا تھی جو کشادہ دل اور شریف تو تھیں مگر زندگی کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل تھیں۔

اسی طرح ان کا ظہور درحقیقت اس محبت اور نصرت کی دو صفتوں کی بنیاد ڈالنے کے ہم معنی بھی تھا جو صفتیں بعد میں پیروانِ مسیح عیسائیوں پر اسلام کے فتح پانے کا ذریعہ بنیں۔

"..... یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گذار اور تارک الدنیا لوگ بھی ہیں جو تکبر میں مبتلا نہیں ہیں۔"

"..... جب وہ رسولؐ کے پاس اترنے والی آیات کو سنتے ہیں تو تم ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھتے ہو، کیوں کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ ایسے لوگ دعا کرتے ہیں کہ اے رب ہمارے، ہم ایمان لے آئے، اس لئے ہمارا شمار حق کی گواہی دینے والوں میں کرلے۔ (سورہ مائدہ)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ کی واپسی کے لئے روانہ ہوگئے۔ آپؐ کے اس مختصر وقت کے تیز گام سفر میں محض چند دن گذرے، لیکن اتنے ہی میں اہلِ قریش کا رنگ اس طرح بدلا ہوا نظر آیا گویا کہ اس سفر میں مہینے اور سال بیت گئے ہوں۔

واپس آکر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان پر غیظ و غضب کا دورہ پڑا ہوا ہے، عداوت کے شعلے بری طرح بھڑک اٹھے ہیں ..... اور آپ کو پھاڑ ڈالنے کے لئے اپنے تیز دانتوں کو نکالے تیار بیٹھے ہیں۔ لیکن طائف کے سفر میں ایک سبق آپ کے تجربہ میں آچکا تھا کہ مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے ہی امید کی کرنیں نمودار ہوا کرتی ہیں ..... اور گمراہی وافترا پردازی کے قدموں تلے ہی سے حق وصداقت کو گلے لگانے والی سعید روحیں نکل کر آتی ہیں .....

پھر طائف کی بوجھل گھڑیوں نے آپ کو ایک اور لذت سے روشناس کرایا تھا... کیا مکہ سے نکل کر یہاں اس غرض سے نہیں آئے تھے کہ بنو ثقیف کو اللہ کی طرف دعوت دیں ...؟ لیکن کیا اس کے نتیجے میں بت پرستی کا مکروہ اور عیّار چہرہ آپ کے سامنے بے نقاب ہو کر نہیں آیا تھا جو توقع رکھتا تھا کہ اس طرح وہ آپ کے قویٰ کو مضمحل کر کے آپ کے بلند حوصلوں کو مایوسی میں بدل کر رکھ دے گا ؟؟

ان حالات میں آپ کے لئے بظاہر ایک ہی چارہ کار رہ گیا تھا جس کو بطور ذریعہ آپ اختیار کر سکتے تھے، وہ یہ کہ آپ مختلف قبیلوں کے پاس جائیں، ان میں اجنبی لوگوں سے ملیں جو نہ آپ کو جانتے ہوں اور نہ آپ ان کو جانتے ہوں اور ان کے سامنے دعوت جراَت و استقلال کے ساتھ پیش فرمائیں۔

حج کا زمانہ اس مقصد کے لئے موزوں ترین موقع ہو سکتا تھا

چنانچہ آپ نے طے کیا کہ ایک ایک کر کے تمام قبیلوں سے جا کر ملیں گے اور ..... ان کے درمیان یہ پیغام پہونچائیں گے کہ :

• میں تمہاری طرف اللہ کا رسولؐ بنا کر بھیجا گیا ہوں"

"وہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ، اور یہ کہ اللہ کے علاوہ جن چیزوں کو اس کے مدمقابل بناتے ہو، ان سب سے تعلق توڑ لو۔

اور یہ کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو، اور میرا ہاتھ بٹاؤ تاکہ اللہ کی طرف سے میں وہ تمام باتیں پہونچا دوں جن کو لے کر اس نے مجھے بھیجا ہے۔"

مگر ہوگا یہ کہ قبائل کے لوگ بھی آپؐ کی باتیں سننے سے منکر ہوں گے بلکہ اس روشنی سے دور بھاگیں گے یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو آپؐ کی دعوتِ حق کو پہچان لیں گے، آپؐ سے سودا بازی کرنا چاہیں گے، اور آپؐ اس کو فوراً رد فرمادیں گے۔ جیسا کہ قبیلۂ بنی عامر صعصعہ کا معاملہ سامنے آیا کہ ..... اللہ کے رسولؐ ابھی اسلام کی پوری دعوت ان کے سامنے پیش بھی نہیں کر سکے تھے کہ ان میں سے ایک بوڑھا شخص کھڑا ہوا۔ اس نے نبیؐ کے اندر سچائی اور نبوت کے آثار پانے کا اعتراف کیا اور اپنے قبیلہ والوں کو ان الفاظ میں متوجہ کیا:

"واللہ۔ اگر میں قریش کے اس شخص کو حاصل کروں تو اس کے ذریعے سے پورے عرب کو نگل جاؤں۔"

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر سوال کیا:

"آپؐ کا کیا خیال ہے، اگر ہم آپؐ کے اس مشن پر آپؐ سے بیعت کرلیں، اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو اپنے مخالفین پر غلبہ

بھی نصیب کر دے تو کیا آپ کے بعد حکومت ہماری ہو گی۔؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا:

"حکومت تو بس اللہ کی ہے، وہ اسے جہاں مناسب سمجھتا ہے دیا کرتا ہے۔" یہ ایک دین ہے، سودا بازی نہیں ہے۔۔۔۔

تنہائی و تنگی کے ان حالات میں بھی، آپ، اس جیسے بڑے قبیلے کو محض دُنیوی امیدیں دلانے سے انکار فرما دیتے ہیں، جبکہ آپؐ ان سے نصرت و حمایت حاصل کر سکتے تھے۔ کیوں کہ یہ معاملہ تو سراسر اللہ کا معاملہ تھا اور یہ اتنا اہم تھا کہ اس کو سودا بازی اور لین دین کے معاملے میں تبدیل کر دینا ہرگز درست نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔

اس طرح آپؐ ہر سال حج کے موسم میں مختلف قبائل کے پاس جاتے رہے، ان کے مشہور میلوں اور اہم تیوہاروں کی تقریبات کے موقع پر ہر مجمع میں پہونچتے رہے۔ ان کو دعوت دیتے اور حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے وہ دن دکھایا جس کا آنا طے تھا۔ اور جب اللہ نے ایسے لوگوں کو آپؐ کے پاس اکٹھا کر دیا جن کو آپؐ کے پاکباز انصار بننے کے لئے اس نے منتخب کر رکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔

یومِ عقبہؓ

هُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ

وہی تو ہے جس نے خود اپنی مدد سے
اور اہلِ ایمان کے ذریعے سے تمہیں
قوت پہونچائی

(سورۃ انفال : ۶۲)

○ آخر کار ..... ، وہ سچا وعدہ پورا ہونے کے قریب آلگا۔ وقت آگیا کہ ایامِ مکہ کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے تاکہ مدینہ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہو۔

ہم یہاں "یومِ عقبہ" کی اہمیت اور امتیازی حیثیت سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ دن دراصل ایک دَور کے خاتمے اور ایک دوسرے دَور کی ابتدا کی طرف واضح اشارہ ہے۔ یہاں سے قریش کی جانب سے عداوت و ایذا رسانی اور پے در پے حملوں کا اور اس کے برخلاف اہل ایمان کی جانب سے مسلسل عجز و انکساری، اور صبر و تحمل سے کام لیتے رہنے کا دَور ختم ہوتا ہے۔ اور ایک ایسا دَور شروع ہوتا ہے جس میں کہا گیا کہ :

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ

(سورہ حج آیت ۳۹)

جن پر لوگ آمادۂ پیکار ہو کر چڑھ آئے، ان کو بھی اب اجازت دیدی گئی، کیونکہ وہ مظلوم بنے چلے آرہے ہیں، اور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

ہاں، ..... یومِ عقبہ اسی امتیاز کا حامل دن تھا، اسلام کا ایک زبردست دن .... اگر یہ دن نہ ہوتا تو مدینہ کی ہجرت کا واقعہ پیش نہ آتا، اگر یہ دن نہ ہوتا تو مدینہ کا دس سالہ دَور بھی وجود میں نہ آتا جس میں نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جنگیں لڑیں جن میں اللہ تعالیٰ کی موافقت نصیب ہوئی۔ اور جس میں آپؐ نے اسلام اور مسلمانانِ عالم کے لئے مضبوط و مستحکم بنیادیں استوار کیں .... !!

اس طرح یومِ عقبہ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لطف و عنایت سے اس کے رسولؐ، اس کے دین اور اس پر ایمان رکھنے والوں کے لئے قوت و عزت اور غلبہ کے دَور کی صبحِ صادق تھی

اور وہ دن ہوشمندی کے ساتھ باطل کی جڑ کاٹنے کے اعتبار سے‘..... فراست و اقدام کے اعتبار سے ..... اور پاسداری و توفیق شامل ہونے کے اعتبار سے راہ کی نشاندہی اور اس پر کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کے ایسے نقوش سے بھرا پڑا تھا، جو بیشتر مواقع پر اسلام کے لئے معاون ثابت ہوئے۔

عقبہ کے تین دن تھے جو تین سال کی مدت میں ظہور پذیر ہوئے ..... لگاتار دو سال میں دو بیعتیں منعقد ہوئیں ....

ہم یہاں پر اپنی گفت گو کو عقبہ کے آخری دن کے لئے مخصوص کر کے آگے بڑھیں گے یعنی ان ایام کے لحاظ سے تیسرا دن، جن میں مدینہ کے طالع آزما جوانوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقاتیں ہوئیں ..... اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے طالع آزما انصار کے درمیان جو دو بیعتیں دو دنوں میں منعقد ہوئیں، اس لحاظ سے دوسرا دن، جو سیرت کی کتابوں میں " بیعت عقبہ ثانیہ " کے نام سے مشہور ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور انصارِ مدینہ کے درمیان تین ملاقاتیں ہوئیں، قدرتی بات ہے کہ خلاصہ کے طور پر اس کو ہم ایک ملاقات اور ایک دن ہی کہیں گے، باوجودیکہ ان کے درمیان زمانی لحاظ سے تھوڑا فاصلہ ہے۔

بایں سبب، ان میں سے کسی دن پر بھی گفت گو کیجئے، بات پورے واقعہ کو سمیٹے ہوئے ہی ہوگی

یہ عظیم الشان ملاقات بعثتِ نبوی کے دسویں سال یعنی ۶۲۰ء میں شروع ہوئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قبائل عرب کے ساتھ تعلقات قائم کرکے انکے سامنے اپنی بات پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا، اس مقصد کے لئے موسمِ حج کو اہمیت دیتے ہوئے آپؐ اس کی طرف پوری توجہ فرما رہے تھے۔ کیونکہ یہاں جزیرۂ عرب کے مختلف علاقوں سے آنے والے قبائل سے ملنا اور ان کے سامنے اپنے رب کا پیغام پہونچانا آپؐ کے لئے سہل تھا۔

بعثت کے دسویں سال موسم حج میں آپؐ کی ملاقات حجاجِ مدینہ کی ایک جماعت سے ہوگئی آپؐ ان کے پاس بیٹھے اور ان سے ان کا وطن دریافت فرمایا۔ ان لوگوں نے اپنا وطن مدینہ بتلایا ان کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔

آپؐ پر درود وسلام ہو۔ آپؐ نے ان سے گذارش کی :

"کیا آپ لوگ کچھ دیر بیٹھیں گے، تاکہ میں آپ سے کچھ باتیں کروں" ......؟؟

آپؐ کی خواہش کو ان لوگوں نے قبول کرلیا، پھر آپؐ نے ان لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان کے سامنے دینِ حق کو پیش فرمایا، جو نور آپؐ کے پاس موجود تھا اسکی ایک پرتو ان کے سینوں میں ڈال دی۔

اَللّٰه، جس کی حکمت کو سمجھنا اور جس کی مشیت (SCHEME) کا احاطہ کرنا خارج از امکان ہے، چاہتا تھا کہ یہود ــــــ جو بعد میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دینِ اللہ کے کٹر دشمن ثابت ہوں گے ــــــ ان کے پیچھے سے ایک ایسی زور آزما قوت فراہم ہوجائے جو اہلِ مدینہ کے اسلام قبول کرنے اور اس میں جوق در جوق داخل ہونے میں موثر ذریعہ بن سکے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ وہ ــــــ یعنی یہودِ مدینہ ــــــ ہمیشہ اوس و خزرج کے

خلاف آمادۂ پیکار رہتے تھے، خاص طور پر خزرج کے خلاف .... یہ لوگ بُت پرست تھے، مورتیوں کی پوجا کرتے تھے جبکہ یہود اہلِ کتاب اور ایک رسول کے پیرو تھے۔

جب کبھی ایک کا دوسرے سے کوئی جھگڑا ہوتا تو وہ یہود دھمکیاں دیتے تھے کہ اچھا، ٹھیر جاؤ، ایک نبی کے ظہور کا وقت قریب آلگا ہے۔ توراۃ ان کے آنے کی خوشخبری سناتی ہے .... پھر وہ کہتے تھے کہ: "جب وہ نبی ظاہر ہوں گے تو ہم ان کے پیچھے ہو جائیں گے اور ان کے مددگار بن کر میدان میں اتریں گے۔ پھر تو ان کے جھنڈے تلے ہم خزرج اور اوس سب اکٹھے لڑلیں گے یہاں تک کہ یا تو ان کو جھکا لیں گے یا پھر تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔ .... !!

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خزرج کی اس جماعت سے گفتگو فرمانے لگے۔ گفتگو ایک ایسے سوال سے شروع کی جس میں نورِ بصیرت اور الہام کی رمق تھی۔ آپؐ نے سوال فرمایا:

"کیا تم لوگ یہود کے غلام ہو".... ؟؟

اس طرح جو ہیجانی لہر آپؐ پیدا کرنا چاہتے تھے، اس سوال کے ذریعے وہ لہر پیدا کر کے اس کے رُخ پر آپؐ نے ایک تیز دھار رکھ دی۔ چنانچہ حیرت انگیز طور پر اس کا زبردست اثر برآمد ہوا۔

اس نفسیاتی موقع پر اللہ کے رسولؐ نے ان کے سامنے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سادہ اور سہل انداز میں اللہ کی دعوت پیش فرما دی۔ اس کے بعد ان کو غور و فکر کرنے کا موقع عنایت فرمایا......

جب ان کے باہمی مشورے کی نشست منعقد ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال پر ان کو وہ بات یاد آگئی جو یہود برابر ان کو دھمکی دے کر کہا کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا:

" بھائیو ! خدا کی قسم، یہی وہ نبی ہے جس کی دھمکی یہود ہم کو دیا کرتے ہیں۔

• اس لئے ہرگز ایسا نہ ہو کہ اس کی طرف بڑھنے میں وہ تم سے سبقت لے جائیں "

اس نشست کے بعد وہ لوگ خدمتِ رسالت میں دوبارہ حاضر ہوئے۔ اور آپؐ کو یہ خبر سناتے ہوئے کہ ہم لوگوں کے سامنے نورِ ہدایت کی جو باتیں پیش کی گئی ہیں، وہ سب پورے طور پر تسلیم ہیں' مزید کہا :

• ہم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا ہے ، کوئی قوم اس قدر باہمی عداوت اور شر انگیزی میں مبتلا نہیں ہوگی جتنی ان کے آپس میں پائی جاتی ہے۔

" جب ہم یہاں سے واپس جائیں گے تو اپنی قوم کو آپؐ کے مشن کی طرف دعوت دیں گے۔ اور اس دین کے متعلق جو جواب ہم نے آپؐ کو دیا ہے ، اس کو بھی ہم انکے سامنے رکھیں گے۔

• اس کے بعد اگر اللہ نے ان کو سمیٹ کر آپؐ کے پاس اکٹھا کر دیا ، تو پھر آپ سے بڑھ کر طاقت والا کوئی نہ ہوگا"

ان کے اور اللہ کے رسولؐ کے درمیان اس موقع پر کوئی بیعت نہیں ہوئی .... صرف انھوں نے اپنے ایمان و تصدیق کا اعلان کیا۔ اور اپنے ان اہلِ قبیلہ و خاندان کے سامنے یہ پیغام پہونچانے

کا وعدہ کیا جو اس سفر میں ساتھ نہ تھے۔

یہ لوگ اپنے شہر میں برکتوں کا خزانہ لیئے ہوئے پہونچے۔ یہ چھ نفری جماعت تھی۔ بڑے شرف کی بات ہوگی کہ ان صفحات کو ہم ان کے بابرکت اسمائے گرامی سے زینت بخشیں۔

وہ اسمائے گرامی یہ ہیں :-

اسعدؓ بن زُرارہ

عوفؓ بن حارث بن رفاعہ

رافعؓ بن مالک بن عجلان

قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ

عقبہؓ بن عامر بن زید

اور جابرؓ بن عبداللہ

جب ہم اللہ کی خوشنودی اور اس کی برکتوں کے نزول کی دعا کے ساتھ ان کا ذکر کر رہے ہیں تو آگے اُن کے ان بھائیوں کا بھی ذکر کریں گے جو اُن کے پیچھے آئے اور اللہ کے دین میں جوق درجوق داخل ہوئے۔

یہ چھ افراد واپس مدینہ پہونچے۔ اس زمانہ میں اس کا نام یثرب تھا۔ لوگوں کے سامنے انھوں نے نورِ رسالت کو بیان کیا جیسا کہ انھوں نے اپنی نظروں سے دیکھا تھا اور آپؐ کی وہ سچی اور روشن کرنے والی باتیں بھی سنائیں جو آپؐ سے انھوں نے سنی تھیں۔

اگلے سال موسمِ حج میں اس قبیلہ کے بارہ افراد مکہ آئے۔ ان میں پانچ تو وہ تھے جو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلی ملاقات میں شامل تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص مقام پر ان کے ساتھ تشریف فرما ہوئے اور ان سے پہلی بیعت لی جس کو "بیعتِ عقبہ اولیٰ" کہتے ہیں۔ اور جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت رضؓ کا بیان ہے جو اس بیعت میں خود شریک تھے؛ واقعہ یوں ہوا:

عقبہٴ اولیٰ میں جو لوگ موجود تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔

اور ہم لوگ دس افراد تھے۔

ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ:

"چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے،

ہم اپنے سامنے کسی پر گھڑ کر بہتان نہیں لگائیں گے۔ اور معروف میں آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گے ....

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اور اگر ان میں سے کسی معاملہ میں تم نے پردہ داری کی، تو تمہارا معاملہ اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے، خواہ وہ عذاب دے، خواہ وہ معاف فرمادے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نورِ بصیرت سے، اور جو کچھ ان بیعت کرنے والوں سے سنا، اس سے یہ محسوس فرمایا کہ اسلام کی ہوا مدینہ میں تیز چلے گی۔ اور ان نئے مسلمانوں کے لئے ایک

معلم وفقیہ کی ضرورت ہوگی۔

چنانچہ آپؐ اپنے اصحاب میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو منتخب فرماتے ہیں اور وہ مدینہ چل دیتے ہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیاب کیا۔ اور ان کے ہاتھوں ایک بڑی فتح نصیب ہوئی......[1]

اگلے سال موسم حج میں حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت ان کے ساتھ تہتر (۷۳) افراد کی جماعت تھی، ہر شخص کی زبان سے یہ کلمہ بلند ہو رہا تھا:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ان کے علاوہ دو خواتین بھی اس نئے دین میں داخل ہوئیں۔ وہ دونوں تھیں:

حضرتِ عمارؓ کی والدہ ماجدہ ——— نسیبہ بنت کعب

حضرتِ منیعؓ کی والدہ ماجدہ ——— اسماء بنت عمرو (رضی اللہ عنہما)

جب یہ قافلہ مکہ پہونچا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو شرفِ ملاقات حاصل ہوا تو وہ عقبہ کا بڑا دن تھا......

حج اور ان مٹی کے خداؤں کی زیارت کے لئے آنے والے وفود سے شہر مکہ اُبلا پڑ رہا تھا۔ ابھی تک یہاں کے باشندوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ قریش کے گھمنڈ اور طاقت کے نشے کے دن پورے ہو رہے ہیں!!

---

[1] دیکھئے ہماری کتاب "رجال حول الرسول"، مصعب بن عمیرؓ ——— اسلام کے پہلے سفیر

مدینہ سے آنے والے ۵ مسلمانوں کی جماعت اپنے ان اہلِ وطن مدنی لوگوں کے ساتھ ہی اپنے خیمہ میں قیام پذیر تھی جو تھے تو بُت پرست، لیکن اسلام سے وہ کوئی دوری محسوس نہیں کرتے تھے۔

ایامِ تشریق کے دوران، حج سے فراغت کے بعد وہ لوگ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بارگاہ میں ایک کامل اور مضبوط دستہ کی شکل میں حاضر ہوئے۔ اور عقبہ کے اسی مقام پر پل بیٹھنا طے کیا جہاں دو مبارک ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔

آیئے! یہاں پر ہم ان بابرکت صحابیٔ رسول ——— حضرت کعب بن مالک رضؓ کو پیش کریں جو اس مبارک ملاقات کی خبر کے سلسلے میں درج ذیل فقرے روایت فرماتے ہیں:

"... ہم لوگ اس رات میں اپنی قوم کے ساتھ اپنے خیمہ میں سوئے۔ جب ایک تہائی رات گذر گئی تو ہم لوگ اپنے خیمے سے نکل کر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے ملاقات کی مقرر جگہ کی طرف چل پڑے۔ ہم لوگ چپکے چپکے، چھپ چھپ کر جا رہے تھے، ٹھیک جس طرح قطا نامی پرندہ چلتا ہے اور عقبہ کے پاس گھاٹی میں ہم لوگ جمع ہو گئے۔ ہم ۷۳ آدمی تھے اور دو خواتین بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ نُسیبہ بنت کعبؓ اور اسماءؓ بنت عمرو... ہم لوگ گھاٹی میں بیٹھے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی آمد کا انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ آپؐ تشریف لے آئے۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبد المطلب بھی تھے۔ جو، اب تک قوم کے دین ہی پر تھے۔ البتہ ان کی خواہش تھی کہ اپنے بھتیجے کے اس مشن میں موجود رہیں، اور آپؐ کے قدموں کو

مضبوط کریں۔

جب آپؐ تشریف فرما ہوئے تو سب سے پہلے بولنے والے حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب تھے......" !!

رات کے ابتدائی پرسکون حصے میں اُس وقت جب قریش کے وہ سردار جو نظریں گڑائے تیار بیٹھے تھے، غافل پڑ گئے، اسلام کی زندگی بلکہ تاریخ انسانی کی زندگی کا یہ سب سے خطرناک اور عظیم ترین اجتماع پایۂ تکمیل کو پہونچا جس نے اسلامی مشن کے انجام پذیر ہونے میں موثر رول ادا کیا اور اس کو عملی روپ دینے میں حصہ دار بنا......

اس خوش نصیب کانفرنس میں قدرت نے مستقبل سے سرگوشی کی، کیوں کہ اب اس کے دروازے وادی کے اس نشیب کی جانب کھل رہے تھے جدھر دو سمتوں سے پانی کا بہاؤ ہے۔ اور اس بہاؤ کا رُخ اللہ کے لشکر کی جانب ہے...... !!!

اس مبارک کانفرنس میں سربراہی و کارروائی کی یکتائے روزگار ذمہ داری رسول اللہؐ اور آپؐ کے چچا حضرت عباس کے سپرد رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس کو اس خیال سے ہمراہ لیا تھا کہ ان کی سوجھ بوجھ اور احساسِ قلب کی تیزی سے ایسی زمین پر قدم رکھنے میں مدد ملے گی جس کی راہ میں حائل دوریوں اور رکاوٹوں کو رسولؐ اللہ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

حضرت عباسؓ خواہ اس وقت تک اسلام لا چکے ہوں اور اپنے اسلام کو چھپا رہے ہوں، .... جیسا کہ بعض تاریخی روایات بتلاتی ہیں، خواہ اسلام نہ لائے ہوں، ____ بہرحال وہ

رسولؐ اللہ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لئے دل میں نہایت نرم گوشہ اور محبت کے جذبات رکھتے تھے اور اب خموشی کے ساتھ پوشیدہ طور پر منعقد ہونے والے اس اجتماع میں جس کے اثرات و خطرات دور رس تھے، ان کا موجود رہنا بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

چنانچہ بات انھوں نے ہی شروع کی۔ بولے:

"اے خزرج کے لوگو!

محمدؐ، جیسا کہ تم جانتے ہو، ہم میں سے ہے، اور ہم نے اس کو اپنی قوم سے بچا کر حفاظت کے ساتھ رکھا ہے۔ چنانچہ آج اس کو عزت و تحفظ حاصل ہے۔ یہ منع کرنے پر نہیں مانا ہے، بلکہ تمہارے پاس آگیا ہے اور اب تمہارے درمیان ہے۔

تم لوگ سوچ لو! اگر تم لوگ سمجھتے ہو کہ جس بات کی دعوت تم لوگوں نے اس کو دی ہے، اس کو تم لوگ پوری طرح نبھا سکوگے، اور جو لوگ اسکی مخالفت کریں گے، ان سے تحفظ دینے میں آگے آؤ گے، تب تو تم لوگ بڑھ کر اس بوجھ کو اٹھا سکتے ہو، لیکن اگر تم یہ محسوس کرو کہ ایسے موقع پر تم اسکی حفاظت نہیں کرسکو گے بلکہ یہاں سے جانے کے بعد تم اسے تنہا لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو گے، تو بہتر ہے کہ ابھی سے چھوڑ دو"......

ایسا لگتا ہے کہ ان کی جانب سے ان کو اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ اس لئے انھوں نے بڑی ذہانت سے ایک چبھتا ہوا سوال ان کے سامنے رکھ دیا۔

ان کی تیز نگاہیں ان کے خیالات اور چہرے کے آثار کو پڑھ رہی تھیں اور وہ بول رہے تھے:

" میرے سامنے جنگ کا نقشہ بیان کرو ، تم اپنے دشمنوں سے کس طرح لڑتے ہو" ؟؟؟ !!

ان کے ایمان و اخلاص سے مطمئن ہو جانے کے بعد حضرت عباسؓ چاہتے تھے کہ جنگی معاملات میں بھی ان کی پختہ کاری سے مطمئن ہو لیں۔[1]

اس سوال نے ان کی خود اعتمادی کے لئے ایک طرح کا چیلنج بن کر ان کے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیا، چنانچہ ان میں سے ایک بوڑھے شخص عبداللہ بن عمرو بن حرام نے بڑھ کر جواب دیا کہ:

" واللہ ، ہم لوگ میدانِ جنگ کے لوگ ہیں۔
جنگ بطور غذا ہماری رگ و پے میں سرایت ہے ، ہم اس کے ماہر اور مشاق ہیں ، یہ ہمیں آباء و اجداد سے پشت در پشت وراثت میں ملی ہے۔"

اس گرم جوشانہ تمہید کے بعد انھوں نے اپنے جنگی طریقہ کار کا ذکر شروع کیا:-

" ہم تیر اندازی کرتے ہیں جب تک تیر ختم نہ ہو جائیں ....
پھر ہم لوگ نیزے چلاتے ہیں جب تک یہ ٹوٹ نہ جائیں .....
پھر ہم لوگ تلواروں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور ان کے ذریعے

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب "رجال حول الرسول" - العباس بن عبد المطلب ـــ ساقی الحرمین۔

زور آزمائی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہمارا یا ہمارے دشمن کا
تیز ترین شخص موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔"

حضرت عباس کے تخیلات پر دھند سا چھا گیا۔ آپ نے کہا:

"تب تو تم واقعی جنگ جو لوگ ہو.....
تو کیا تمہارے پاس زرہیں ہیں؟"

لوگ بول اٹھے:

"ہاں! ہاں.... ہمارے پاس پورا ڈھانپ لینے والی زرہیں
موجود ہیں۔"

اب حضرت عباسؓ نے دیکھا (اللہ ان سے، اور ان سب لوگوں سے راضی ہو) کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آگے بات کرنے کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے خموشی اختیار کر لی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نگاہ کی۔ پھر غور سے سننے کیلئے اپنا سر جھکا لیا۔

رسولِ خدا مسکرائے، آپؐ کی باوقار نظریں عقبہ کے خوش نصیب لوگوں پر روشنی اور برکتیں بکھرنے لگیں۔

آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ اب وہ لوگ کچھ بولیں۔
لیکن ان کی آوازیں اس ایک جملے پر رک گئیں کہ:

"بس اب آپ فرمائیں اے اللہ کے رسولؐ!
"اب آپؐ اپنے رب کے لئے اور اپنے لئے ہم سے جو چیز لینا پسند

فرمائیں ، وہ لے لیں"........

آپؐ کے ہونٹ اس سیدھی سچی بات پر مسکراتے ہوئے کُھل گئے اور اگلے دانتوں سے نور کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔

آپؐ نے کلام شروع فرمایا۔ سب سے پہلے قرآن عظیم کی آیات تلاوت فرمائیں جو آپؐ پر نازل ہوئی تھیں.... پھر ان کو اللہ تعالیٰ کی باتیں سمجھاتے رہے کہ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے! پھر اسلام کے متعلق سمجھایا کہ وہ دین ہے جو انسان کو اندھیروں سے نکال روشنی میں لے آتا ہے۔ اور غلبہ واقتدار والے حمد و ثنا کے مالک کے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اس کے بعد لوگوں سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا !

• تم مجھ کو اس چیز سے تحفظ دو گے جس سے تم اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو ...." ؟

براء بن معرور جھٹ اٹھے اور آپؐ کے دستِ مبارک کو پکڑ لیا۔ بولے :

" ہاں اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے ....

" ہم آپؐ کی ضرور ان چیزوں سے حفاظت کریں گے جن سے ہم خود کو بچاتے ہیں۔

" آئیے اللہ کے رسولؐ ! ہم آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔

" واللہ ، ہم لوگ میدان جنگ کے بہادر اور حلقۂ اثر کے مالک ہیں یہ چیزیں ہمیں پشت در پشت ملتی آئی ہیں ......"

ابوالہیثم اٹھے اور بولے :

"اے اللہ کے رسولؐ ! ہمارے اور یہودیوں کے درمیان جو تعلقات ہیں ہم انھیں کاٹ لیں گے۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم یہ سب کچھ تو آپ کے لئے کریں ، لیکن جب اللہ تعالیٰ آپؐ کو غلبہ عنایت فرمادے تو اس وقت آپؐ اپنی قوم سے جا ملیں اور ہمیں چھوڑ دیں"...... ؟؟

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخِ انور اِن امید افزا احساسات پر جذبۂ شکر سے لبریز مسکراہٹ لئے کِھل رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا :

"نہیں ، بلکہ خون خون ایک ......

" عزّت عزّت ایک ....

. میں تمہارا شریک اور تم میرے شریک۔

. جس سے تم لڑو ، اس سے میں لڑوں ،

. جس سے تم ملو ، اس سے میں ملوں ، ....."

عربوں کے یہاں " اَلدَّمُ اَلدَّمُ ، اَلْھَدَمُ اَلْھَدَمُ "یعنی خون خون ایک ، عزّت عزّت ایک ، کہنے کا مفہوم یہ ہوتا تھا کہ تمہارا ذمہ میرا بھی ذمّہ ہے ، تمہاری عزّت میری عزّت ہے ، اور تمہارا عہد میرا عہد ہے۔ یعنی دونوں کی زندگی اور موت بس ایک ہے....

اس جواب کے بعد حضرت عبادہ بن انصاریؓ اٹھے اور اپنے انصار ساتھیوں سے مخاطب ہوئے :

" کیا تم نے سمجھا کہ اس شخص کے ہاتھ پر تم کس چیز کی بیعت کر رہے ہو؟؟

"اے گروہِ خزرج، تم ان سے سیاہ اور سُرخ لوگوں سے جنگ مول لینے کی بیعت کر رہے۔

۔ لہٰذا اگر تم کو یہ کرنا ہے کہ جب تمہارے مال تباہ ہونے لگیں اور تمہارے شرفار قتل کئے جانے لگیں، تو تم ان کو حوالہ کر دو گے، تو اس سے بہتر ہے کہ ان کو ابھی سے چھوڑ دو۔

۔ کیوں کہ، خدا کی قسم! اگر اس وقت تم نے ایسا کیا تو یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی کا باعث ہوگا۔....

۔ لیکن اگر تم اپنے مالوں کی تباہی اور اشراف کے قتل کے باوجود اس عہد کو پورا کرو گے، تو ان کو اپنا لو.......

۔ پھر تو خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا باعث ہوگا۔"

اس سوال پر سب ایک ساتھ بول اٹھے:

"ہم ان کو اپنائیں گے، مال کی تباہی اور اشراف کا قتل ہوتا ہو تو ہو......"

اسی دوران میں کسی نے کہا:-

"اے اللہ کے رسول! اگر ہم نے یہ عہد پورا کیا تو ہمارے لئے اس کا کیا صلہ ہے؟"

صادق وامین صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک لفظ میں جواب عنایت فرمایا:

"جنّت !"...... !!

دفعتہً یہ خفیہ کانفرنس ایک جشنِ مسرت میں تبدیل ہوگئی۔ ہر طرف ایک آواز گونج رہی تھی :

" ہاتھ بڑھایئے ، اے اللہ کے رسولؐ ! ہم بیعت کریں "

آپؐ کے دائیں ہاتھ کی جانب لوگوں کے ہاتھ بڑھنے لگے۔ اس زبردست عہد و پیمان اور گرمجوشی کی محبت کو آپؐ کا دستِ مبارک پکڑ پکڑ کر لوگ پختہ کرتے رہے۔

ایک انوکھی تنظیم وجود میں آئی جس سے ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کام لینا تھا کہ وہ عظیم مشن جو پیشِ نظر تھا، پایۂ تکمیل کو پہونچے۔

اللہ کے رسولؐ نے اپنے سامنے موجود وعدۂ الٰہی کے ان مقداروں کی طرف نگاہ ڈالی گنتی کے لحاظ سے تو تہتر (۷۳) مرد اور دو۲ خواتین تھے ...... لیکن قیمت کے اعتبار سے انکی مقدار ایک عظیم امت کی تھی جس کی باقاعدہ صورت گری اب کی جائے گی !!

اگر ہم محض عددی حساب ہی کے طور پر بھی ان کی طرف نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذہانت اور بھرپور کوشش سے آگے آگے رہنے والی اس جماعت کو ایک مستحکم اور فعال تنظیم کے دائرے میں لا کر ہی چھوڑا۔

آپؐ نے اُن سے فرمایا :

تم اپنے درمیان سے بارہ۱۲ نقیب ہمارے پاس بھیجو، جو اپنے قوم کے حالات کی نگرانی کر سکیں"

لوگوں نے بارہ۱۲ نقیب منتخب کئے جو محض اپنے ان بقیہ ساتھیوں کے ذمہ دار اور جوابدہ نہ ہونگے بلکہ..... عنقریب زمانہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے ان تمام مومنین کے بھی جن کے دلوں کو

اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کھول دے گا ......

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو نقیبانہ اختیارات سپرد کئے تو اس وقت آپؐ کے سامنے ایک بلیغ اور بامقصد حکمت تھی۔

اسی طرح بارہ کی تعداد میں نقیب مقرر کرنے میں بھی ایک بلیغ اور بامقصد حکمت تھی۔ وہ یہ کہ اثر و نفوذ اور جوابدہی کا دائرہ کشادہ رہے، تاکہ کسی انفرادیت پسندی اور ارتکازِ قوت کی گنجائش باقی نہ رہے۔

بیعت مکمل ہوگئی .... نقباء کا تقرر بھی عمل میں آگیا ..... اس رہبرِ خموش شب نے اس یکتائے روزگار اور عظیم الشان کانفرنس کے تمام حالات کا مشاہدہ کرلیا..... اب اس کے بعد تمام شرکاء یہاں سے اپنے خیموں میں واپس آگئے ——— فجر سے قبل، آثارِ صبح نمودار ہونے سے پہلے پہلے، بالکل اسی طرح چپکے چپکے جس طرح قطا پرندہ کی طرح یہاں جمع ہوئے تھے۔

لیکن حق پرستی کی غیرت و حمیت کے ان جانبازوں پر یہ بات شاق گذر رہی تھی کہ تصادم اور فیصلے کے کسی اور دن کی راہ دیکھتے رہیں۔ چنانچہ عباد بن عبادہ انصاریؓ بول اٹھے:

"اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ اٹھایا ہے، اگر آپ پسند فرمائیں تو صبح ہم منیٰ کے ان تمام لوگوں پر اپنی تلواریں لیکر ٹوٹ پڑیں۔"

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہادیانہ انداز میں فرمایا:

"ہم نے تم کو یہ حکم نہیں دیا ہے۔"

"بلکہ تم لوگ اپنے خیموں میں لوٹ جاؤ۔"

خصوصیات میں شامل تھا۔ اس کا مشاہدہ ہم قبل بھی کر چکے ہیں، یہاں بھی دیکھنے میں آتا ہے اور آئندہ بھی ہمیں اس بات کا مشاہدہ ہوگا کہ جب بھی عام حکیمانہ عمل کا کوئی موقع آیا تو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یہ خصوصیت نمایاں طور پر کارفرما رہی۔

یہ لوگ سپیدیٔ سحر نمودار ہونے سے قبل اپنے خیموں میں چلے گئے۔ اور اب دن نکل آیا۔ اِدھر قریش کے لوگ ہر طرف کان دھرنے لگے کہ کہاں کیا ہوا؟ اسی اثنا میں ان کو ایک ایسی خبر مل گئی جس نے ان کے اندر اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی اور ان کا سارا سکون درہم برہم ہو گیا

ان کے چند سربرآوردہ لوگ خزرجیوں کے خیمے میں دوڑے آئے۔ اور ان کو مخاطب کر کے کہا:

" اے گروہِ خزرج!

" ہمیں خبر ملی ہے کہ تم لوگ ہمارے اس آدمی کے پاس گئے تھے، تم اس کو ہمارے درمیان سے نکال لے جانا چاہتے ہو اور تم لوگوں نے اس کے ہاتھ پر ہم سے جنگ کرنے کی بیعت بھی کی ہے......

" ویسے عرب کے کسی قبیلہ کے ساتھ ہماری ایسی کوئی عداوت نہیں ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان تمہارے سبب سے جنگ چھڑ جائے۔"

خزرج کے مشرکین کو جب ان کی یہ بات معلوم ہوئی، تو وہ بے چارے لگے قسمیں کھانے کہ ایسا

کوئی معاملہ نہیں ہوا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں سچے بھی تھے .... کیوں کہ رات کو جو کچھ ہوا تھا اس کی ان کو مطلق خبر نہ تھی۔ یہ اہل ایمان اس وقت ان کے درمیان سے نکلے تھے جب وہ خواب غفلت میں تھے۔ اور ان کے بیدار ہونے سے قبل وہ واپس آچکے تھے..... اور اس طرح کروٹیں لے رہے تھے گویا کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو ..... !!

زعمار قریش یہ جواب پاکر حیرانی اور شش و پنج میں پڑ گئے۔ واپس آکر انھوں نے تحقیق شروع کی۔ بالآخر اس خبرِ عظیم کے امر واقعہ ہونے کا یقین ہو گیا۔ وہ طیش میں آئے ان حاجیوں کے پیچھے دوڑ پڑے جو شعائر اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد اپنے گھروں کو جانے کے لیے سواریاں بڑھا چکے تھے۔ سوار بڑی تیزی کے ساتھ چلا اور دُور تک دھاوا کیا۔ لیکن اہل قریش ان میں سے دو کے سوا کسی کو نہ پا سکے۔ وہ دونوں تھے حضرت سعد بن عبادہؓ اور منذر بن عمروؓ۔ اور یہ دونوں بارہ [12] نقیبوں میں سے تھے۔ حضرت منذرؓ نے تو ہاتھ پاؤں مارا اور ان سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ..... آخر وہ لوگ حضرت سعد بن عبادہؓ کو لئے مکہ پہونچے۔ ان کو زدو کوب کرتے اور ایذا پہونچاتے رہے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو خزرج کے سربرآوردہ لوگوں میں سے ہیں، جبکہ ان کے قافلوں کے شام جانے اور آنے کا راستہ مدینہ میں ان کی چراگاہ سے ہو کر گذرتا ہے تو ان لوگوں نے ان کو بسلامت اپنی راہ لینے کے لئے آزاد کر دیا۔

یہ تھی وہ پہلی چوٹ جو اہل قریش کو کیچڑ میں گر کر کھانی پڑی، اور جس کی ٹیس وہ محسوس کر رہے تھے......

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خموشی مگر پوری قوت کے ساتھ جو نشانہ بٹھایا تھا، اس سے

ان کو یہ پہلی چوٹ پہونچی تھی جبکہ انھوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو ایک عرصہ سے اپنی عداوت اور ایذا رسانی کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اہلِ قریش نے مسلسل بارہ سال تک اپنی برتری اور گھمنڈ کے نشے میں چوٹیں پہونچانے کا ایک سلسلہ تھا جو جاری رکھا تھا۔ آخر آج وہ وقت آگیا کہ مکافاتِ عمل کے ضابطہ کے تحت انصاف کے معروف اصولوں کے مطابق اب وہ قصاص کی چوٹوں سے دوچار ہوں۔

اُدھر دیکھو، وہ بارونق اور آباد سرزمین آج اپنے ہاتھوں کو پھیلائے اور اپنے دامن کو کشادہ کئے، اس اُبھرتے ہوئے نئے دین کا وطن بننے کے لئے منتظر کھڑی ہے، جبکہ قریش نے اپنے یہاں اس دین کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ اور اپنی جہالت و عداوت کے رویّہ سے ان کے لئے زمین تنگ کر دی تھی۔

ہاں، تو بس امروز فردا میں مکہ کے اہل ایمان ہجرت کر کے محبت کی فضا سے معمور سرزمین کا رُخ کرنے والے تھے اور ان کے پیچھے ہی ان کے محبوب پیغمبر بھی چل کر ان کے پہلو میں آموجود ہونے والے تھے۔

یہاں یہ تحریک ہر بندش سے آزاد ہو گی..... مدینہ طیبہ کا محل وقوع دفاعی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ کیوں کہ مکہ کے تجارتی قافلوں کو مکہ اور شام کے درمیان آمد و رفت میں جس گذرگاہ کو عبور کرنا پڑتا تھا وہ اہل مدینہ کے دانتوں کے درمیان تھی کہ جب وہ چاہیں ان کو چبا ڈالیں۔

اب زمین، اہل قریش کو لئے گردش کر رہی تھی، اور اہل قریش اپنی دنیا کے اچانک بدل جانے کے اندیشوں اور خطرے کے ان احتمالات کے چکر میں پڑ گئے تھے جن کے سبب سے

ان کے دل خوف اور گھبراہٹ کے مارے دھڑکنے لگے تھے۔

یہی وہ صورتِ حال تھی جس کے تحت وہ لوگ اصحاب رسولؐ کی ہجرت کی راہ میں روڑے بن رہے تھے۔ لیکن آخر کار وہ اپنے اس مشن میں بھی ناکام ونامراد ہی رہے۔

اب ان کے پاس آخری حربہ بچ رہا تھا اس کو بھی انھوں نے استعمال کر ڈالا۔ وہ یہ کہ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو غفلت کی حالت میں ہلاک کرنے کا منصوبہ تیار کیا..... لیکن وہاں تو قدرتِ الٰہی کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنی اس روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافروں کو یہ بات کتنی ہی ناگوار ہو۔

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کے دن ایک ایسا کارنامہ انجام دیا، جو کمال درجہ علم وآگہی، تجربہ کاری اور راستبازی کا مظہر تھا۔

عقبہ کی اس ملاقات اور بیعت نے قریش کی ان تمام شبانہ روز سازشوں اور ناعقلی کی حرکتوں کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیئے جس کو وہ مسلسل بارہ سال تک اللہ کے دین، اس کے رسولؐ اور اہل ایمان کے خلاف اپنے تمسخر کے ذریعے بنتے چلے آرہے تھے۔

اور اب ...... اسلامی تاریخ میں یومِ عقبہ کے ضیاپاش ہو جانے کے بعد اہل قریش کے لئے راتوں میں بیٹھ کر سازشیں کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہ گیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ ان کے ہونٹوں پر گھمنڈ کی جو مسکراہٹیں ہوا کرتی تھیں وہ دم توڑ دیں.....!

ہاں ہاں !........ اہل قریش کو آج کے بعد اپنے ان قربانی کے بکروں کے ساتھ تماشا کرنے کا موقع کبھی نہیں ملے گا۔ بلکہ اب تو وہ ان خطرات سے نمٹنے میں مصروف

ہو رہیں گے جوان کو گھیرے میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور جو شرک کی قوت کے لئے جائے شکست اور پیامِ اجل ثابت ہوئے .... !!

یومِ حمزہؓ

مَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ، فَبِإِذْنِ اللّٰهِ

اور تمہیں اس دن جو کچھ نقصان پہونچا، جب دو
جماعتیں باہم گتھ گئیں ، وہ سب اللہ ہی
کے اِذن سے تھا۔

(سورۃ آل عمران: ۱۶۶)

یہ ایک ایسا دن ہے کہ اس کا بیان کوئی آسان بات نہیں ہے.....
بغض وکینہ سے بھرے جذبات کا دن، ساتھ ہی نہایت دردناک،
سبق آموز اور جوش وولولہ پیدا کرنے والا دن بھی.....

یہ دن جس کو ہم "یوم حمزہؓ" کے نام سے یاد کر رہے ہیں، تاریخ میں "یوم اُحد" کے نام سے مشہور ہے۔

درد والم کے اس موقع کو ہم "یوم حمزہؓ"[1] اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ان صفحات میں ہماری گفتگو کا منشا "غزوۂ احد" نام کی جنگ کا حال بیان کرنا نہیں ہے..... بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ اس غزوہ اور اس دن کے بہت سارے واقعات میں سے اس واقعہ کو موضوعِ سخن بنائیں جو مؤرخانہ جذبات کو سب سے زیادہ برانگیختہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی، شخصیتِ رسولؐ اور مزاجِ رسالت پر بھی کافی روشنی ڈالتا ہے۔

یعنی حضرت امیر حمزہؓ کے ساتھ اس میدانِ کارزار میں پیش آنے والا حادثہ اور ان کی شہادت، پھر ان کے جسم کے ساتھ معاندین قریش کا یہ بہیمانہ سلوک کہ رگوں کو کاٹ کاٹ کر جسم کا خون بہایا گیا.....

پھر خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا بچشم خود اپنے محبوب چچا کے جسم کو اس حال میں مشاہدہ فرمانا کہ شکم چاک کیا ہوا ہے اور آنتیں نکال کر بکھیر دی گئی ہیں۔

پھر.....
لیکن نہیں، آیئے ہم گفتگو کا آغاز بالکل ابتدا ہی سے کریں۔

---

[1] امیر حمزہؓ بعثت کے چھٹے سال مشرف باسلام ہوئے یعنی ہجرت حبشہ اور مقاطعہ کے درمیانی سال میں۔ اسی سال حضرت عمرؓ بھی ایمان لائے تھے۔

رسولِ خداؐ نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی۔ ان مبارک لوگوں کے درمیان جو انصار بنے تھے، آپؐ اور آپؐ کے اصحاب قیام پذیر ہوئے۔ اور اب مدینہ طیبہ کو اپنے نئے دین اور اس نئی امت کے لئے مرکز بنا لیا۔

اب اہل ایمان قریش کے کوڑوں اور ایذا رسانیوں سے دور ہو چکے تھے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ مشکلات سے ان کا پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ بھلا بنیادوں کی تعمیر اور تبلیغ رسالت کا کام انجام دینے والوں کو مشکلات سے چھٹکارے کا کیا سوال؟

ہجرت کے ابتدائی ایام میں جو سب سے بڑا لطف حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ اب ان کو ایک ایسی سرزمین ہاتھ آگئی تھی جہاں ایک اللہ کی بندگی کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی اور اپنے دین پر عمل درآمد کے سلسلے میں کسی قسم کے خوف یا ایذا رسانی سے دوچار ہونے کا کوئی اندیشہ موجود نہ تھا۔

لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد، زندگی کی صعوبتیں اور ابتلا و آزمائش کی سنتیں اس انتظار میں کھڑی تھیں کہ اس طرح ان حالات سے گذار کر ایک متحرک قیادت (LEADERSHIP) اور ایک نہایت قابل اعتماد گروہ روبعمل لایا جائے جو جیالے لوگوں کو زمانے کے ان احوال سے سبق آموز حکایت سنائے جس سے ان کو یہ معلوم ہو سکے کہ: معرکہ حق کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ اور اس ساری جدوجہد، سختی و تنگی، ایثار و قربانی اور فداکاری کی غرض کیا تھی.....؟!!

جب یہ حضرات مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے تھے تو بخار کی ایک وبا چل پڑی تھی چنانچہ یہ بھی اس وبا کے شکار ہوئے، مگر قدم رکھتے ہی اس مصیبت میں مبتلا ہونے کو انھوں نے اپنے لیے کوئی فالِ بد نہیں سمجھا..... بلکہ اس کا مقابلہ کیا اور صبر سے کام لیتے رہے۔

ابھی ان کے پاؤں مدینہ میں جمنے بھی نہ پائے تھے کہ وہاں کے یہودی باشندے اور

منافقین ان کے خلاف چالیں چلنے لگے۔ وہ ان کا مذاق اڑاتے اور ان کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرتے پھرتے۔

اس نئے دینِ حق سے ان کو بڑی ناگواری تھی۔ اس لئے اس کے علم بردار، مہاجرین اور انصار کے خلاف ــــــ خاص طور پر مہاجرین کے خلاف ــــ انھوں نے ایک گھٹیا اور عیّارانہ قسم کی اعصابی جنگ چھیڑ دی۔ حالاں کہ ان کے اندر اس قسم کی اعصابی جنگ، شکوک انگیزی اور ایذا رسانی کی ویسی صلاحیت نہ تھی جیسی کفّار قریش کے اندر پائی جاتی تھی۔

..... چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ آپ اس سیلاب پر بند باندھنے کی طرف پوری توجہ مبذول فرمائیں جو یہود کے علماء و زعماء کی جانب سے ہزار عہد و پیمان کے باوجود انتہائی شد و مد کے ساتھ برپا کیا جا رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مکّاری اور افترا پردازی کے اس سیلاب کی جانب بھی توجہ دینا ضروری ہو گیا تھا جو بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے منافقین کی جانب سے امڈا چلا آ رہا تھا۔

"وہ اللہ کو دھوکہ دینے کے درپے ہیں جب کہ اللہ خود ان کو دھوکہ میں ڈالے ہوئے ہے۔"

وحیِ الٰہی نے ہر طرف سے انھیں گھیر رکھا تھا۔ ان کی ہر خفیہ بات کو وہ آشکارا کیئے دے رہی تھی، ان کی چالوں کی مذمت کرتی اور ایمان و یقین کو پختہ تر کرتی جا رہی تھی..... وہ ہدایت کی راہ اختیار کرنے والوں کو اسی سمت میں آگے بڑھاتی جا رہی تھی۔

ادھر وقفہ وقفہ سے اہلِ قریش اپنے پختہ کار لوگوں کو مدینہ بھیجا کرتے تاکہ وہاں کے احوال کی پوری خبر لے کر آئیں..... دوسری طرف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حکمتِ عملی برسرِ عمل تھی کہ گاہے گاہے چھوٹے چھوٹے دستے ان کی طرف روانہ فرما دیا کرتے۔ یہ دستے

جاکران کو منتشر کر کے واپس بھگا دیتے تھے۔

یہاں تک کہ بدر کی جنگ کا دن آگیا..... دو گروہ مقابلے میں کھڑے ہو گئے، زبردست جنگ ہوئی، اور قریش بری طرح پھنس گئے۔

اپنے سربراہوں کی ماتحتی میں ایک ہزار جنگی جوان آدھمکے تھے۔ ہر جوان مسلح اور تربیت یافتہ تھا۔ ان کا نشانہ یہ تھا کہ سیدھے جاکر مدینہ پر حملہ کر دیں اور نورِ الٰہی کی قوت اور خیر کے روشن سرچشمہ کو وسیع افق میں دفن کر دیں۔

ادھر اپنے نبیؐ کی قیادت میں تین سو تیرہ مسلمان نکل کھڑے ہوئے باوجودیکہ ان کی اکثریت جنگی لحاظ سے غیر تربیت یافتہ تھی۔ پھر فتحمند قوت بننے کے لیے جو تیاری درکار تھی، اس تیاری کا بھی موقع ان لوگوں کو نہیں مل سکا تھا۔

اس دن ایمان کی قوت نے اپنا کرشمہ دکھایا، اللہ کی تائید و نصرت حاصل کر کے کامیابی حاصل کرلی....... وہی ایمان جو قلیل تعداد مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھا۔ اس ایمانی قوت کے اوپر ایک اور قوت کام کر رہی تھی۔ اللہ کے جاں نثار بندوں کے کانوں میں ان کلمات کی آواز آرہی تھی جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کریم سے التجا کرتے ہوئے فرما رہے تھے:

"اے میرے اللہ! یہ قریش کے لوگ اپنی جنگی قوت اور فخر و غرور کے ساتھ نکلے ہیں کہ مجھ سے جنگ کریں اور تیرے رسولؐ کو جھوٹا ثابت کریں۔

"پس اے اللہ! تیری وہ مدد چاہیے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔"

اس دن اللہ والوں نے دیکھا کہ آپؐ اپنے خیمہ کی جانب بڑھے جا رہے تھے اور تلاوت فرماتے جا رہے تھے۔

سَیُھۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ بہت جلد یہ جتھا شکست سے دوچار ہو گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گا۔ (سورہ قمر : ۴۵)

چنانچہ ہوا یہی کہ ایمان نے ایک زوردار جست لگائی، کفر ایک دم حواس کھو بیٹھا اور باطل سرنگوں ہوگیا۔ اہل قریش پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن ساتھ ہی جس خطۂ زمین پر معرکہ آرائی ہوئی تھی اسی کی مٹی کے نیچے وہ اپنے ان زعماء اور "بڑوں" کی لاشیں دفن کر گئے جو بیچارے کمزور اہل ایمان پر ایذاؤں کا پہاڑ توڑتے رہے تھے۔

اہل قریش بدر کی جنگ میں اپنے لشکر کی صفوں میں ابوجہل، عتبہ، شیبہ، ولید بن عتبہ، اور امیہ بن خلف جیسے آزمودہ سورماؤں کو آگے آگے لے کر آئے تھے..... لیکن جب واپس گئے تو ان سب کی لاشوں کو ایک کنواں میں ڈال گئے۔ ان سورماؤں کے علاوہ مزید ستر لاشیں اور ستر قیدی بھی چھوڑ گئے۔

اس ذلت آمیز شکست کی تلخی کو وہ ہر وقت محسوس کرتے رہے.....اور انکی عداوتیں بھی ان کو دوبارہ ابھارتی رہیں۔ چنانچہ ان کا ایک سال پوری تیاری اور طاقت مہیا کرنے میں صرف ہوگیا۔ وہ اس جذبہ سے مغلوب تھے کہ مدینہ منورہ پر ایک اور حملہ کر کے اس بار اسلام پر مکمل فتح پالیں اور رسولؐ و اصحابِ رسولؐ کا بالکلیہ استیصال کر ڈالیں۔

تقریباً اسی وقت سے جب وہ دھمکی دے کر واپس آئے تھے، پوری قوت کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ بنی کنانہ اور اہل تہامہ کی جمعیت بھی ان کے ساتھ ہوگئی.....ان کے اکثر جنگی جوانوں کے ساتھ ان کی خواتین بھی موجود تھیں تاکہ ان کے پاس جو کچھ جمع جتھا تھا اور خونریز جنگ کرنے کی جتنی قوت ان کے پاس موجود تھی سب کو پورے جذبۂ حمیت کے

ساتھ جھونک دیں۔

یہ تھے وہ حالات جن میں "احد" کی جنگ لڑی گئی .... ایک بھیانک جنگ...!!



قریشی فوج تین ہزار کی تعداد میں صف آرا تھیں، پیدل فوج کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھوں میں تھی۔ اور گھوڑسواروں کی کمان خالد بن ولید نے سنبھال رکھی تھی

رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار مسلمانوں کو لے کر نکلے۔ آدھے راستہ میں جا کر ان کی تعداد تقریباً سات سو رہ گئی۔ کیوں کہ رئیسِ منافقین عبداللہ بن اُبی جو بدر میں مسلمانوں کی عظیم الشان فتح و کامرانی کو دیکھ کر دائرۂ اسلام میں آگیا تھا، خود واپس ہو گیا اور اپنے ساتھ تین سو آدمیوں کو بھڑکا لے گیا.....!!

لشکرِ شرک نے اپنا مورچہ سنبھال لیا..... اور رسولِ خداؐ نے اہل ایمان اعوان و انصار کو جبل احد کی جانب پشت کر کے صف آرا کیا۔ آپ نے پچاس تیر اندازوں کو ایک اونچے ٹیلے پر رکھا تاکہ عقب کی جانب سے وہ مسلمانوں کی حفاظت کرتے رہیں۔ اور اگر اُدھر سے مشرکوں کی جانب سے کوئی کارروائی عمل میں آئے تو یہ لوگ ان کو پسپا کر دیں۔ کیونکہ پہاڑی کے دامن میں ایک کشادہ راستہ ایسا تھا کہ اگر مشرک ادھر سے موقع پا جاتے تو مسلمانوں کو سخت گزند پہنچا سکتے تھے۔

اب جنگ شروع ہو گئی۔ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ اہل قریش کا دائرہ سمٹتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ مسلمان اپنے دشمنوں کے چھوڑے ہوئے مالِ غنیمت کو سمیٹنے میں لگ گئے یہاں تک کہ وہ تیر انداز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ

حکم بھول گئے کہ وہ اس مقام کو اس وقت تک ہرگز نہ چھوڑیں جب تک جنگ اپنے انجام کو نہ پہنچ جائے ..... اور وادی میں اتر گئے۔ وہ بھی اپنے بھائیوں کے جشن فتح میں شریک ہو کر غنیمت کے مال و اسباب اکٹھا کرنے میں منہمک ہو گئے۔

بس، یہ رخ دیکھ کر، قریشی گھوڑ سواروں کے قائد ــــ خالد بن ولید ــــ نے اسی راستہ کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ ایک سو گھوڑ سوار تھے۔ اور تیروں جیسی تیزی کے ساتھ گھوم کر پہاڑی کے اس کھلے راستے میں گھس پڑے جہاں پر یہ تیر انداز حفاظت کیلئے مقرر کئے گئے تھے۔

ان گھوڑ سواروں نے پیچھے کی جانب سے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ اور تیروں تلواروں کی بوچھار شروع کر دی۔ ادھر ان کے پیدل لوگوں نے جب اپنے گھوڑ سواروں کی یہ کارروائی دیکھی، تو ان کا کمانڈر ــــ ابو سفیان ــــ بھی ان کو لے کر دوبارہ پلٹ آیا۔ اس طرح مسلمان ایک خوفناک گھیرے میں پڑ گئے..... اور جنگ از سرِ نو بھڑک اٹھی۔ لیکن اس بار کے حملے میں معرکہ قریش کے حق میں تھا جس کو اپنی کھوکھلی برتری کا غرور ستانے لگا۔



اس ہولناک جنگ میں حضرتِ حمزہؓ کس مقام پر تھے..... ؟؟

وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان تھے۔ خود بھی مصروفِ جنگ تھے اور ان کے ساتھی بھی شیر کے مانند مرنے یا مارنے کے حیرت انگیز اور فیصلہ کن ولولہ کے ساتھ پامردی دکھلانے میں مصروف تھے۔

تمام اہل ایمان "احد" کے دن اس طرح جنگ کر رہے تھے کہ..... نہ اس سے قبل کبھی لڑے تھے، نہ اس کے بعد اس طرح لڑے !!

ابو دجانہؓ... مصعبؓ بن عمیر... حنظلہؓ بن ابی عامر... عاصمؓ بن ثابت... علیؓ...
ابو بکرؓ... سعدؓ... نسیبہؓ بنت کعب... طلحہؓ... زبیرؓ... حارثؓ بن صمہؓ... اور تمام وہ اصحابِ قرآن و اصحابِ محمدؐ جو میدان کارزار میں سرگرم تھے..... دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ہم ان کی چڑھتی جوانی کے جذبات پر نظر ڈالیں گے اور ان کی للکار کی پکار پر کان دھریں گے..... !!

حمزہؓ بن عبد المطلب بھی ان جانبازوں کے ساتھ تھے جو اپنی زندگی کا سودا اللہ سے کر چکے تھے.... وہ بھی ان کے شانہ بشانہ جست لگا لگا کر تلواریں چلا رہے تھے۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا، اس لحاظ سے وہ مشہور تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کبھی معرکہ کارزار میں ہوتے تو اپنے سینے کو شتر مرغ کے پروں سے مزیّن کر لیتے تھے۔

قریش کے جھنڈے کو دیکھ کر آپ کو طیش آتا۔ اور آپ معرکہ آرائی کی فضا میں اڑنے لگتے۔ علمبردار پر اپنی نظر کو مرکوز کر کے عقاب کے مانند اس پر جھپٹ پڑتے۔ اس طرح علم برداروں کو ایک ایک کر کے تہِ تیغ کرتے جا رہے تھے.....

دیکھا کہ عثمان بن ابی طلحہ نے علم اٹھایا ہے اور فخر و شجاعت کا شعر پڑھ رہا ہے۔ پھر کیا تھا صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھے اور اس پر ایسی تلوار چلائی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس طرح قریش کا جھنڈا قدموں کے نیچے آ رہا۔

گھمسان کی جنگ میں حضرت امیر حمزہؓ تیروں کی سی تیزی کے ساتھ بیچ میں گھس کر پل پڑتے۔ خود ان کی تلوار پر کسی کی ضرب نہیں پڑتی، لیکن جب ان کی تلوار کسی پر پڑتی تو موت اس کو ایک قدم ہٹنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔

ایک بار پھر دیکھا کہ قریش کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے۔ بس وہ صفوں کو چیر کر آگے بڑھے اور اس کے علمبردار ارطاۃ بن عبد شرجیل پر ایسا وار کیا کہ وہ خاک و خون میں لت پت ہو کر رہ گیا اور جھنڈا مشرکوں کے خون سے رنگی ہوئی زمین پر آ رہا۔

اب وہ میدانِ کارزار کے قلب میں آ گئے تاکہ اپنی تلوار "مطیع" سے دشمنانِ خدا و رسولؐ کو موت کے گھاٹ اتار دیں......!!

جوں ہی مڑ کر دیکھا کہ ایک مشرک قریشی جھنڈا پر جھک رہا ہے اور اس کو اٹھا کر پھر بلند کرنا چاہتا ہے، آپ اپنی تیز سانس کو برابر کئے بغیر پھرتی سے آگے بڑھے اور قبل اس کے کہ جھنڈا فوج کے سروں سے اوپر جاتا، امیر حمزہؓ کی شمشیر براں نے اس کو آ لیا اور وہ پاس کی زمین پر خون میں تڑپتا نظر آنے لگا۔

سچ مچ وہ ٹھیک ویسے ہی تھے جیسی ان کی تعریف اللہ کے رسولؐ نے فرمائی تھی۔

"اللہ کا شیر، اللہ کے رسولؐ کا شیر"

وہ بڑی بڑی آزمائشوں کے لیے خود آزمائش بن کر کھڑے ہو جاتے اور اسے تنگ کر ڈالتے تھے۔ ہمیشہ قریش کی سختیوں کا مقابلہ یقین سے معمور قلب، عزم و حوصلہ سے بھرپور ارادہ، اور نہ تھکنے والی تلوار سے کرتے آئے تھے۔

لیکن اہل قریش تو بدر کے دن سے ہی غم و اندوہ اور شرمساری کا بوجھ ڈھو رہے تھے..... چنانچہ جب ایک ایک کر کے سب کے سب "احد" کی جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے تو پہلے ہی سے انھوں نے خطوط کار اور جنگی حکمت عملی طے کر دی تھی۔ ان کا نشانہ یہ تھا کہ اس بار دو اشخاص پر فتح حاصل کر کے لوٹیں، خواہ اس کے بعد انجام جو کچھ بھی ہو۔

یہ دو اشخاص تھے : رسولِ خدا..... اور آپ کے چچا امیر حمزہؓ......

ویسے ان کو ذاتِ رسالت مآبؐ کے سلسلے میں ناکامی کا اندیشہ لاحق تھا کیوں کہ وہ آپؐ کے ساتھیوں کی آپؐ کے ساتھ محبّت و فداکاری کا حال اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی حکمتِ عملی اور نقشۂ کار کو حضرت امیر حمزہؓ پر مرتکز کر لیا۔

ان کا سر حاصل کرنے کے تمام نقشے انھوں نے مکہ سے روانگی کے قبل ہی مرتب کر لئے تھے اس مقصد کے پیشِ نظر ان لوگوں نے ایک ماہر نیزہ باز کو اس مہم کے لئے منتخب بھی کر لیا تھا۔ بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمام نیزہ بازوں میں وہ شخص اتنا نشانہ باز تھا کہ وہ جس پر نیزہ چلادے اس کا ڈھیر ہونا لازمی تھا..... اس کا نام "وحشی" تھا، وہ جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔

حبشہ کا ایک نحیف سا غلام تھا۔ لوگوں نے اس کو وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر "حمزہ" کو قتل کرنے میں تم کامیاب ہو گئے تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی، تم آزاد کر دئے جاؤ گے۔

ابوسفیان کی بیوی نے، جو جنگ بدر میں اپنے باپ، بھائی اور بیٹے سے محروم ہو چکی تھی ..... آگے بڑھ کر وحشی کی نظروں کو اپنے گلے اور کلائیوں میں پڑے سونے کے چمکیلے زیورات کی طرف منعطف کیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس شخص کے منہ میں پانی آنے لگا ہے اور اس کی چمک دمک سے اس کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں، مگر ـــــ اب بھی اس نے ان زیورات کا عطیہ طلب نہیں کیا ـــــ تو ہندہ نے خود بڑھ کر اس کے اندر لالچ کی آگ بھڑکانے کے لیے اپنے ان بھاری زیوروں کو ہلانا شروع کیا جس سے زیور میں جھنکار اور چمک پیدا ہوئی۔ اب وہ وحشی کی نظروں سے نظریں ملا کر کچھ بولی جس کا منشا صاف ظاہر تھا کہ :

"اگر تم حمزہ کو قتل کر ڈالو تو یہ سب تمہارا ہے۔"

لوگوں کے ساتھ وحشی بھی میدان میں چلا گیا۔ اس کے ذمّے صرف یہ مہم سونپی گئی تھی کہ وہ حضرت حمزہؓ کو اپنے ترغے میں لے لے۔

اس میدان جنگ اور معرکہ آرائی میں حضرت امیر حمزہؓ کا حال ہم اوپر دیکھ چکے ہیں. وہ پل پڑتے تھے، قتل کر ڈالتے تھے اور خدا و رسولؐ کے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ہی دم لیتے تھے ..... ان کو گھیر کر لقمۂ اجل بنا ڈالنے کے لئے مشرکین جب بھی ان پر ٹوٹتے تھے تو ان کی تلواریں امیر حمزہؓ پر پڑنے سے پہلے ہی ٹوٹ کر رہ جاتی تھیں۔ مگر ان کا پورا زور تھا کہ کسی طرح ایک زخم بھی ان کو لگ جائے تا کہ ان کی چنگھاڑ بند ہو جائے یا ان کو اتنا بھی گزند پہنچ جائے جس سے ان کی تلوار رک جائے ......!!

اس میدان میں ایک بلند قامت نحیف الجثہ شخص موجود تھا جس کے قبضے میں کمان سی جڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے نیزے تھے۔ وہ مسلمانوں کی شمشیروں کی وار سے بچتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں حضرت امیر حمزہؓ پر جمی ہوئی تھیں، ہنگامۂ کارزار کی دوا دوش میں اس کی نظریں بھی ڈوبتی اور ابھرتی تھیں ____ جب اس کا نشانہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا، تو وہ شخص کسی اونچے مقام پر چڑھ کر اپنی دزدیدہ نظروں کو اس نشانہ کے پیچھے ڈال دیتا جس کو وہ شکار بنانا چاہتا تھا۔

اس موقع کے لمحات کو وہ خود اس طرح بیان کرتا ہے کہ :

"بخدا میں تو بس حمزہؓ کو تاک رہا تھا۔ وہ لوگوں کے جھرمٹ میں مٹیالے رنگ کے اونٹ کی طرح گھس جاتا اور کمال شجاعت کا مظاہرہ کرتا نظر آتا تھا۔ وہ کہیں ٹکتا نہ تھا۔ اتنے میں سباع بن عبد العزیٰ مجھ سے آگے بڑھا۔ حمزہؓ نے اس کو للکار کر کہا کہ : "اے تنگدامن رائگاں شخص! چل، میری طرف آگے بڑھ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایسا وار کیا کہ اس کے سر کا نشانہ خطا

نہ ہوا۔ اسی دوران میں نے اپنے نیزے سنبھال لئے، جب میں پوری طرح تیار ہوگیا تو میں نے نیزے اس پر چلا دیے جو جاکر اس کی پنڈلی کے پاس گھس گئے اس کی ناف کے نیچے اور دونوں ٹانگوں کے درمیان سے نکل گئے۔ اب وہ میری جانب بڑھا مگر بے قابو ہوچکا تھا۔ اس لئے تلملا کر زمین پر گر پڑا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ خود بخود موت کی آغوش میں چلا گیا۔ میں اس کے نزدیک سے پلٹا، پلٹ کر اپنے نیزے سنبھالے اور جنگ سے کنارہ کش ہوگیا۔

..... کیوں کہ اب اس کے بعد میری حاجت باقی نہ رہی .....



جنگ کو قدرتی طور پر ختم ہونا ہی تھا چنانچہ خاتمہ کی منزل کو پہنچ گئی تلواریں تھک گئیں، تیر اندازی ختم ہوئی اور شور و شغب بند ہوگیا۔ ..... کسی کو پتہ نہ تھا کہ کون گرا اور کون بچا۔ اس بھیانک جنگ کے دو دور چلے ..... پہلے دور میں مسلمانوں کو فتح و نصرت کا شرف حاصل ہوا۔ اور دوسرے دور میں وہ آزمائش کی لپیٹ میں آگئے۔ جس میں (کامیابی و ناکامی) دونوں قسم کے امکانات موجود تھے۔

ہاں، یہ ایک سخت آزمائش تھی ..... اگرچہ یہ آزمائش ہرگز شکست کے ہم معنی نہیں تھی۔ کیوں کہ رسولِ خدا نے اپنی زندگی میں کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔

اللہ نے ہمیشہ آپؐ کو اپنی مدد کا وعدہ فرمایا ..... اور اپنا وعدہ اس نے ہمیشہ سچ کر دکھایا۔ احد کے میدان میں جو کچھ واقعات پیش آئے، وہ آج تک انسانی جنگوں کی پوری تاریخ میں کسی جنگ کے معیار کے لحاظ سے بھی شکست نہیں کہے جا سکتے ہیں۔

ہم ایک صاحبِ رائے کے ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ جن

میں بھی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ میں اس رائے سے بے حد محظوظ اور متاثر ہوا ہوں۔ میرے خیال میں اس رائے کے ذریعے غلط طور پر پھیلے ہوئے تصوّرات کی اصلاح بڑی مضبوطی کے ساتھ ہو جاتی ہے ـــــ کہ یوم احد میں جو کچھ بیتا وہ شکست تھا..... تحقیقی طور پر اخذ کردہ اپنے ان خیالات کو ذرا شرح و بسط کے ساتھ اور نہایت صاف ستھرے طور پر بیان کرنا چاہیں گے تاکہ اس ننگِ اسلام تصوّر کی بھرپور تردید ہو جائے۔

یہ محکم و درست رائے ایک ہندستانی صاحبِ علم مولوی محمد علی صاحب نے اپنی کتاب "حیات و رسالتِ محمدؐ" (انگریزی) میں ظاہر کی ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں:

"...... ان کا ـــــ یعنی مشرکوں کا ـــــ حال، مسلمانوں کے حال سے کچھ بہتر نہ تھا۔ انھوں نے جنگ کو انجام تک پہنچانے کی جرأت نہ کی کیوں کہ ان کو خود خوف لاحق تھا کہ اب اس کے بعد کہیں میدان کا رخ ان کی تباہی و ہلاکت کی طرف نہ پلٹ جائے۔

یہی سبب ہے کہ جب انھوں نے مکہ کا رخ کیا تو بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتے جا رہے تھے۔ اوسط چال کے حساب سے ہر دن کئی کئی میل زیادہ چل رہے تھے۔

راستہ بھر ان کے درمیان یہ سوال موضوعِ بحث بنا رہا کہ کیا فاتح بن کر لوٹنے کا دعویٰ کرنے میں ہم لوگ حق بجانب ہوں گے؟!

ان کو مالِ غنیمت کا ایک معمولی حصہ بھی ہاتھ نہیں لگا تھا جس کو فتح کی علامت کے طور پر اپنے قبیلوں کے سامنے وہ پیش کر سکتے۔ اور نہ ان کے قبضہ میں کوئی ایک قیدی ہی تھا..... تو کیا اس صورت حال کو ہم فتح سے تعبیر کر سکتے ہیں.....؟

اس کے برخلاف، اسلامی لشکر ہمیشہ میدانِ کارزار میں صف بستہ رہا۔ باوجودیکہ مدینہ

میں دفاع کرنے والا کوئی موجود نہ تھا، پھر بھی یہ لوگ اس بستی کو لوٹنے کی ہمت نہ کر سکے۔

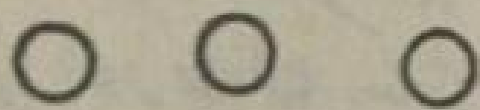
کیا یہ مشرکوں کے لئے فتح کی علامت قرار پا سکتا ہے؟؟

مسلمان دوسرے ہی دن اپنے دشمنوں کے تعاقب میں چل پڑے۔ اور مدینہ سے آٹھ میل دور حمراء الاسد کے مقام تک پہنچ گئے۔ جب کہ اس کے برخلاف خود ابو سفیان، جو شعور کی پختگی کو شجاعت کا ایک اعلےٰ عنصر سمجھتا تھا، منہ موڑ کر چلتا بنا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تمام فوجی جوان بھی اسلامی نیزہ بازوں کی پامردی و جانبازی کی داستانیں سن سن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگر ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ معرکۂ احد میں مسلمان شکست پا گئے تو یہ تاریخی حقائق سے بے خبری و چشم پوشی ہوگی۔

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ وہ ایک زبردست خسارہ کی آزمائش سے دوچار ہوئے لیکن یہ بھی ماننا ہوگا کہ خود اہل قریش بھی ناکامی و بربادی کا کلنک لئے ہوئے واپس ہونے پر ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

پھر کیا فتحمندی کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا ملتا ہے کہ مغلوب دشمن نے میدان میں پھر سے پاؤں جما لئے ہوں؟ اور دوسری جانب فاتح فوج قیدیوں کے بغیر واپس آئی ہو۔۔۔۔۔۔ یہاں تو اس کے برخلاف ہوا کہ مسلمان نیزہ بازوں کی داستانیں سن سن کر فاتح فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔۔۔۔



نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں کو کبھی شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔۔۔۔۔ احد کے میدان میں جو کچھ پیش آیا، وہ تمام تر مصیبتوں کے باوجود کسی بھی جنگی معیار کے اعتبار

یے شکست کی نوعیت بہرحال نہیں تھا۔

اور جیسا کہ مولوی محمد علی صاحب نے لکھا ہے کہ مشرکوں کے قبضے میں ایک بھی قیدی نہ تھا اور نہ ان کو مالِ غنیمت کا کوئی حصہ ہاتھ لگا تھا ..... نہ انھوں نے مسلمانوں سے کوئی شرط منوائی اور نہ ان کی زندگی کے معاملات میں کوئی تبدیلی لا سکے تھے۔ بلکہ جس فتح کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اس کے چند گھنٹوں کے اندر وہ مسلمان نیزہ بازوں کے سامنے سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے جب ان کو گمان ہوا کہ اب اگر ٹھیرے تو ہزیمت اٹھا کر مغلوب ہو جانے کا امکان ہے.....

اس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ جو چیز انگیز کرنی پڑی وہ صرف مشقت تھی جس نے آخر کار مسلمانوں کے دلوں کے اندر مضبوطی پیدا کر دی اور ان کے عزائم کی چنگاری کو سلگا دیا۔ انھوں نے اس واقعہ سے ٹھیک وہی سبق حاصل کیا جو اللہ تعالےٰ ان کو دینا چاہتا تھا، اور انھوں نے اس سبق کو خوب جذب و حفظ کر لیا۔



اب آئیے! یہاں سے ہم پھر "شیرِ خدا" اور "شیرِ رسولؐ" حضرت امیر حمزہؓ کی جانب پلٹیں۔[1]

جنگ دوسرے دور میں ختم ہو گئی ..... اللہ کے رسولؐ اپنے اصحاب کے درمیان کھڑے جاں نثار شہیدوں کی شناخت کا بندوبست فرما رہے تھے۔

اس ہولناک دن کی دوڑ دھوپ سے رسول اللہؐ تھک کر چور تھے۔ آپؐ کو ضرب لگی تھی۔ آپؐ کے اگلے چار دانت شہید ہو گئے تھے، آپؐ کا رخ انور متورم ہو رہا تھا، دونوں ہونٹ زخمی تھے۔ لیکن جب تک شہیدوں کی لاشوں کے متعلق واقفیت حاصل نہ ہو جائے، اور جب تک

---

[1] حضرت امیر حمزہؓ کی شخصیت اور شجاعت کے متعلق مزید مطالعہ کیلئے ملاحظہ ہو میری تصنیف "رجال حول الرسول"۔

آپؐ اس جگہ پر پہنچ کر جہاں چچا امیر حمزہ پڑے تھے، اپنی نظروں سے زخموں کے ان نشانات کو نہ دیکھ لیں جو ان کے جسد مبارک اور کلیجہ پر پڑے تھے، اس وقت تک آپؐ کو خود اپنی تکلیفوں کو برداشت کئے رہنا گوارا تھا۔۔۔۔۔!!

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصحاب کو بھیجا کہ میدانِ جنگ میں جاکر شہدا ء کو شمار کرکے ان کی شناخت کریں۔

وہ صحابہؓ لوٹ کر آگئے۔۔۔۔۔ جیسے جیسے آپؐ کے محبوب و مخصوص لوگوں کا نام لیا جاتا آپؐ اللہ کے نزدیک ان کے اجر اور مقام کا اندازہ بتلاتے جاتے۔ ان میں مصعب بن عمیرؓ ۔۔۔۔۔ سعد بن ربیعؓ ۔۔۔۔۔ انس بن نضرؓ ۔۔۔۔۔ ابوسفیان بن حارثؓ ۔۔۔۔۔ حنظلہ بن ابو عامرؓ ۔۔۔۔۔ عبداللہ بن جبیرؓ، پچاس تیر اندازوں کے سردار جو اس وقت بھی پہاڑی پر اپنی جگہ جمے رہے تھے جب کہ تمام تیر اندازوں نے پہلے دور میں مالِ غنیمت سمیٹنے کے لیے وادی کا رخ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ عمرو بن قیس اور ان کے صاحبزادے قیس بن عمر رضی اللہ عنہما۔۔۔۔۔ اوس بن ثابتؓ ۔۔۔۔۔ عبداللہ بن عمرو بن حزامؓ ۔۔۔۔۔ عمرو بن جموحؓ ۔۔۔۔۔ اور ان سب کے دسیوں بھائی تھے ـــــــ مہاجر اور انصار ـــــــ جنہوں نے "احد" کے دن اپنے پاکیزہ خون کی قربانی دی اور اپنی زندگی اللہ کی راہ میں کھپا کر اس کی رضا اور جنت کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

اب اللہ کے رسولؐ کی خواہش ہوئی کہ چل کر ان کو ان کی شہادت گاہوں پر دیکھیں کہ وہ کس کروٹ پڑے ہیں۔ چند صحابہؓ کے کاندھوں کے سہارے چلے، بکھری ہوئی لاشوں کے درمیان ان پر اللہ کی سلامتی اور رحمت کی دعائیں پڑھتے جا رہے تھے اور پکار پکار کر انکو الوداع کہہ رہے تھے!!

لیکن جب آپؐ کی نظر کسی کچلی اور مثلہ کی ہوئی لاش پر پڑتی تو زبان مبارک سے ظالموں

کے خلاف نفرت اور اپنے دل کو صبر دینے والے کلمات جاری ہو جاتے.....

ذرا تصور کیجئے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و تحمل کا کیا حال ہوا ہو گا جب آپؐ کے قدم مبارک اپنے محبوب چچا حضرت امیر حمزہؓ کی جسدِ شہادت سے قریب پہنچے ہوں گے اور آپؐ نے ان کے شکم کو چیرا ہوا..... کلیجہ نکال کر پھینکا ہوا..... اور آنتوں کو بکھرا ہوا ملاحظہ فرمایا ہو گا.....!!!

آپؐ پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو اے سراپا خیر! اے سراپا برّ و صلاح!!

آپؐ پر اور آپؐ کے عم محزن شہید اعظم پر اللہ کی سلامتی و رحمت نازل ہو۔

آپؐ پر اور آپؐ کے آل و اصحاب پر اللہ کی سلامتی اور رحمت و برکت نازل ہو۔



اہل قریش کو جب بھی اس بات کا احساس ہوتا کہ ان کو فتح و نصرت کا کوئی حصہ نصیب نہیں ہوا..... رسول اللہ تو اب سدا کے لئے بچ کر ایک زندہ شخصیت بن گئے..... اُن کے اصحاب اب ان کے گرد ہمیشہ بے نیاز پروانے بنے رہیں گے..... اور مدینہ دن بدن مضبوط سے مضبوط تر بنتا چلا جائے گا..... تو ان پر جنون طاری ہونے لگتا..... خاص طور پر جب وہ یہ دیکھتے کہ ان کے ہاتھ فتح و نصرت کے ثمرات سے یکسر خالی تھے..... نہ مال غنیمت ملا نہ کوئی قیدی ہاتھ آیا۔ اپنے تمام وسائل اور قوتوں کو جھونک کر بھی وہ اپنے لئے قربان گاہ سے زیادہ کچھ نہ بنا سکے۔

انھوں نے تین ہزار کی تعداد میں ہو کر کل سات سو کے مقابلے میں جو کرشمے دکھلائے تھے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھے کہ صرف ۶۵ مسلمانوں کو شہید کر سکے۔

حالاں کہ (ان کی تیاریوں، قربانیوں اور ہمت و حوصلہ کے اعتبار سے) اس میدان کو ایسی "قربان گاہ" بنا دیا تھا جو تاریخ انسانی کی بڑی سے بڑی "قربان گاہ" کے معیار سے کہیں بلند ہوتی، اتنی بلند کہ اس کو بنانے کا تقاضا کے تحت وہ اپنے تمام بالغ مردوں کو اس کی نذر کرنے کے لئے تیار رہتے اور شرف و مردانگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ایک نشان قائم کر جاتے، یا کم از کم اتنی شرافت و مردانگی کا مظاہرہ تو ضرور ہی کرتے جتنی عام عرب بلکہ بدّو تک روا رکھتے ہیں۔

مگر اس پہلو سے تو وہ مثلہ کرنے تک کے جرم کے مرتکب تھے، جب کہ مثلہ کرنا خود جاہلیت کے معیار کے لحاظ سے بھی ایک مذموم فعل تھا



جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمِ محترم کو دیکھا تو کیا دیکھا.....؟

لوگوں نے ان کے جسم کو پھاڑ ڈالا ہے..... شکم کو چیرا ہے..... ابوسفیان کی بیوی ہند نے کلیجہ نکال کر عداوت میں اس کو چبایا ہے..... ان کی آنتوں کو کھینچ کھینچ کر بکھیر ڈالا ہے بلکہ کچھ حصے کو اپنی گردن میں ڈال کر طوق بنایا ہے... اور انکی ناک اور کانوں کو تراش ڈالا ہے!!

ذرا غور کرو، دیکھو، رسولؐ خدا کے اندر کس قدر بردباری اور تحمل تھا اور اپنے رب کی مرضی کے آگے کس طرح سرنگوں تھے۔ کیوں؟ ___ اس لیے کہ اس وقت آپ کو پوری روئے زمین کے برابر قوت کی ضرورت تھی تاکہ آپ اس منظر کے متحمل ہو سکتے جس کو دیکھ کر پہاڑ بھی کانپ اٹھتے بلکہ پھٹ جاتے۔ یہ قوت آپؐ کو حاصل ہوئی......!!

آپؐ کے اندر غیض و غضب نے جوش مارا مگر آپؐ نے اس کو بجھا دیا..... لیکن آخر کب تک؟..... کتنے منٹ..... بلکہ کتنے لمحے تک ایک انسان، خواہ وہ کتنے ہی بڑے تقدس کا

حال ہو، ایسے منظر کو دیکھ کر اپنے غصّہ کی آگ کو بجھائے رکھ سکتا ہے ؟

اس مصیبت کے غم واندوہ میں آپؐ کے پپوٹوں سے آنسو رواں تھے..... لیکن کیا ان پپوٹوں کے آنسو کو ایسی قدرت حاصل تھی کہ وہ سراپا فریاد امرِ واقعہ اور دل کو ہلا دینے والے منظر کو اوجھل کر سکتا.....؟

آپؐ کے لیے بس اللہ تھا (اس کے سوا کسی کو قوت نہ تھی جو کام آتی)

آپؐ کے لئے بس اللہ تھا، اے اللہ کے رسولؐ ... اے نورِ حیات و شرفِ زندگانی۔ ... اے خیر الخلائق..... اے خاتم المرسلین۔ (آپ پر درود۔ آپ پر سلام) !



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس منظر کے اثرات پر قابو پانے کی کوشش فرماتے رہے۔ پھر اپنے پیارے چچا کی لاش کی طرف ایک نظر ڈال کر فرمایا:

"آپ پر جیسی مصیبت آئی، ویسی کبھی کسی پر نہیں آئی..... اور جس جگہ ابھی میں کھڑا ہوں، آج تک اس سے زیادہ غصّہ مجھے کبھی کسی دوسری جگہ نہیں آیا"....

اس دن کے بعد بھی آپؐ ان کا ذکرِ خیر اپنی جماعت میں بارہا فرماتے رہے..... کیونکہ حضرت امیر حمزہؓ محض عمِ رسولؐ نہ تھے..... بلکہ آپؐ کے ہم عمر بھی تھے..... دونوں نے بچپن کا دور بھی ایک ساتھ گذارا تھا اور جوانی کا دور بھی، ساتھ ہی وہ آپؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔

حضورؐ کا پاس و لحاظ کرنے والے لوگوں کے درمیان بھی ان کے چرچے جگہ جگہ ہوتے رہے۔ اور خود حضورؐ کے خیالات میں بھی ان کا تصوّر ایک عرصہ تک گھومتا رہا..... ان کی یاد ذہن سے نکلتی ہی نہ تھی..... اس طرح بار بار آتی رہتی کہ گویا امیر شہید کو الوداع کہنے اور رسولِ خدا کی

تعزیت کرنے آتی ہو ......! اور ان کی شجاعت وا ٓ ہنی شخصیت ..... اور کل کے میدان کارزار میں ان کے جلال کی کیفیت کو تازہ کرتی ہو ......!!

شاید آپؐ اپنے دل میں سوچتے تھے' یا شاید یہ یادیں ذہن میں سوال پیدا کرتی تھیں کہ کیا یہ حمزہؓ ہی ہیں جن کا یہ حال کیا گیا ہے۔؟؟

تم خود غور کرو' اس خستہ حال لاش کے حق میں کیسی تعزیت اور بدلہ لینے کی کن جذبات کا اظہار آپؐ فرما رہے ہیں ..... ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں گہرے غم میں ڈوبی ہوئی عم محترم کی لاش پر ٹکی ہیں اور دانتوں کو دبا کر غصہ کے عالم میں آپؐ یہ دل دہلا دینے والے کلمات فرماتے ہیں:

"اگر صفیہؓ کے ملال کا خیال نہ ہوتا (جو حضرت حمزہؓ کی بہن اور حضورؐ کی پھوپھی تھیں) اور اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میرے بعد اس طریقہ کو اختیار کرلیں گے' تو میں ان کو اسی حال میں چھوڑ دیتا کہ درندوں کے شکم میں چلے جائیں یا پرندوں کی غذا بن جائیں ......!!

ہاں' ..... زمین کے اندر اتنی وسعت کہاں کہ اس خستہ حال بوجھل لاش کے خون کا بدلہ لے کر رہنے کی للکار اس میں سما سکتی۔ رہی درندوں کے شکم کی بات تو شاید اس شیر کے جسمانی ریزوں کی مناسب ترین جگہ وہی ہو سکتی تھی .....

رسول پاکؐ نے اپنے اس قول کو پھر دہرایا کہ :

"اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اہل قریش پر کبھی غلبہ دیا' کسی بھی خطۂ زمین پر' تو ہم اس ایک کے بدلے ان کے تیس اشخاص کا مثلہ کر کے رہیں گے "

یہ بات سن کر آپؐ کے صحابہ پکار اٹھے کہ :

"خدا کی قسم! اگر اللہ نے ہمیں کبھی ان پر فتح دی، تو ہم ان کا مثلہ اس طرح کر ڈالیں گے کہ عرب کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی۔"

یہاں پہنچ کر "یوم حمزہ" کا جمال و جلال مکمل ہو جاتا ہے۔ اور رسولؐ خدا اور آپ کے اصحاب کرامؓ پر اس دن جو کچھ بیتا اس کے متعلق اللہ تعالےٰ کی حکمت و مصلحت کیا تھی، اس کو واضح کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔!!

ابھی رسولِ خدا اور مسلمانوں کے یہ دکھ آمیز جملے پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک وحی نازل ہوتی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ
الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ۔
اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ
وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ط وَاِنْ عَاقَبْتُمْ
فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ .... وَلَئِنْ
صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ط وَاصْبِرْ
وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ
وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ ۔
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ
مُّحْسِنُوْنَ (سورہ نحل آیت ۱۲۵)

اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو اسی قدر لو کہ جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو، لیکن اگر صبر اختیار کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔ اے نبی صبر سے کام کئے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالبازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔

وحیِ الٰہی ہر بات کی نگرانی کر رہی تھی اور تمام باتیں سن رہی تھی۔

اور قدرت نے اس دن انتہائی زبردست حکمتوں کے معاملات چھوڑ رکھے تھے۔

چنانچہ جسد شہید کے مثلہ کا حادثہ اور اس کے علاوہ جو کچھ پیش آیا اس کے تعلق سے اس ہیبتناک جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے پیغام الٰہی نے اپنے درس کا عنوان ان ہی (حکمتوں) کو بنا لیا۔ گویا اس دن کی کٹی پھٹی اور خستہ حال لاشیں توضیح ربانی کا ذریعہ بنیں جو حسب ذیل تھیں.....!!

دیکھو..... اے ایمان والو..... اے وہ لوگو جو رسولؐ کے گرد کھڑے ہو، اور اے مستقبل کے وہ لوگو جو ان جیالے انسانوں سے نصیحت حاصل کرنے آؤ گے.....

یہ حمزہؓ ہیں..... عمِ رسولؐ.....

کیا اللہ ان کی زندگی کو بقا عطا فرمانے سے قاصر تھا.....؟؟

اور یہ جو اس کی بکھری ہوئی لاش ہے، کیا اس کو چیر پھاڑ سے بچانے کی قدرت اللہ تعالیٰ کو حاصل نہ تھی.....؟؟

بالکل تھی.....

تو پھر آخر کون سی وجہ ہو سکتی ہے کہ آج تمہارے سامنے اس قسم کا لرزانے اور جوش میں لے آنے والا واقعہ پیش آگیا...؟؟ اس بات سے اللہ کے رسولؐ تم کو ابھی آگاہ کریں گے۔

پھر ذرا قدرت کا انتظام بھی دیکھو۔ حمایت حق اور پیش قدمی کے نمونے بھی خود ذات رسالت اور آپؐ کے اپنے خاندان کے پاکیزہ نفوس ہی کو بناتی ہے۔

حق کی حمایت اور فداکاری کے لئے ہمیشہ ایثار کی حاجت ہوتی ہے ـــــ اور ایثار دراصل شرافت انسانی کی علامت اور امتیازِ حیات ہے۔

ایثار و قربانی کو ہمیشہ شرف ہی کا مقام حاصل رہا ہے۔ البتہ اس پہلو سے ضروری ہے کہ ظلم و سرکشی کی راہ سے مسلط کی جانے والی قربانی کی شکل کو اس سے خلط ملط نہ کیا جائے اور اس کو اہمیت

نہ دی جائے

کیوں کہ قربانی کا لفظ کسی پاپیادہ قافلہ پر صادق نہیں آتا ہے (جو کہیں ظلم کا شکار بن جائے) بلند حوصلہ لوگوں کے لیے برابر ہے، ان کو مقامِ شہادت خواہ صحیح و سالم جسد کے ساتھ میسر آجائے، خواہ ان کے جسد خاکی کے ریزے ریزے کردئے جائیں۔

بہرصورت، ان کی بیشتر قربانیاں انکو عزت و شرف سے ہمکنار کرتی ہیں۔ یا مصیبتیں ان کے مقام بلند پر فائز ہونے کا ذریعہ بنتی ہیں اور اچانک پیش آنے والے حادثات ان کو بلند حوصلہ لوگوں کے مقام تک پہونچاتی ہیں ......!!

ذرا ٹھیر کر سوچو، ..... اے ایمان والو!

یہ دیکھو، تمہارے رسولؐ جو ایک بشر ہیں، ان پر وہ غصہ بھی طاری ہوتا ہے جو حلیم و بردبار ہونے کے باوجود بشری تقاضا ہے۔ چنانچہ آپؐ مجرموں کو اِس ایک کے بدلے ان کے تیس مقتولوں کا مثلہ کردینے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اگر اللہ نے ان پر فتح نصیب کی، کل ہو، یا پرسوں ......

توکیا اللہ نے ان کو چھوٹ دے دی کہ وہ اپنی دھمکی کو اس کے بعد بھی بیان کرتے رہیں۔؟؟

ہرگز نہیں .....

اللہ تعالیٰ نے ان کی بات سن لی ..... اور پلک جھپکتے ہی وحی پہونچی اور یہ نصیحت سنا گئی کہ ... نہیں، نہیں، .. تم اتنا ہی بدلہ ان سے لو جتنا انھوں نے تمہارے ساتھ قصور کیا ہے .....

"اور اگر تم صبر کرلو، تو صابر بندوں کے حق میں یہ اس سے بھی بہتر بات ہے۔"



خدا کی قسم، یہ کتنا شاندار درس تھا، اور کیسی بیش قیمت نصیحت تھی ....

چنانچہ جنگ اور خونریزی کی سرزمین تک میں... اللہ تعالےٰ اپنا کلام رسولؐ پر نازل کرتے ہوئے یہی فرماتا ہے کہ:

"لوگوں کو بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف، بڑی حکمت کے ساتھ اور نصیحت کے اچھے پیرائے میں۔"

میدانِ جنگ میں اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ کو یہ نصیحت نہیں فرمائی کہ: "لوگوں سے جنگ کرو ایسے طریقے پر جو عمدہ ہو۔" (قَاتِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ)

بلکہ فرمایا: "بحث کر کے ان کو سمجھاؤ ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو" (جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ)

یہاں اس تاکید سے معلوم ہوا کہ آپؐ کو جو دور ملا اس کا مزاج اور خود رسالت کا جوہر دراصل یہی تھا... یہ تو کارِ نبوت ہے جس کا مقصد اللہ کی ہدایت کو مطمئن کرنے والے عمدہ کلمات کے ذریعے لوگوں کی طرف منتقل کرنا ہوتا ہے...... یہ کوئی جنگ نہیں ہے جو تیر و تفنگ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو جنگ کرنے پر مجبور اس وقت ہوئے جب آپؐ کے اور دین کے دشمنوں نے وہ حالات پیدا کر دیئے جن میں جنگ ایک ناگزیر ضرورت بن گئی۔

اور جیسے ہی یہ ضرورت ختم ہوئی اور حالات بدلے، نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کے جوہر، اپنے مشن اور کارِ رسالت کی جانب متوجہ ہو گئے



ان توضیحات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہم نے جو عنوان منتخب کیا ہے "یوم حمزہ" یہ تمام مختلف پہلوؤں سے "یوم احد" کی بہ نسبت کتنا موزوں عنوان ہے......

اس طرح حضرت حمزہؓ کی جائے شہادت، اور وہ درس جو اس جگہ سے حاصل ہوا، اس دن پیش آنے والے تمام واقعات میں باوزنی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب اس کے بعد وہ واقعات، جو اُن کی جائے شہادت اور ان کے اپنے اور ان کے پاکباز ساتھیوں کے پیش کردہ مثالی نمونہ کے علاوہ رونما ہوئے ان کو بھی ایسی مناسب جگہ ملنی چاہیے جن کے وہ حقدار ہیں۔

جہاں تک قریش کا معاملہ ہے، ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ وہ فتح سے ہمکنار نہیں ہوئے۔ اور مسلمان، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ہزیمت سے دوچار نہیں ہوئے۔

مسلمانوں میں سے کل ۷۵، افراد نے شہادت پائی.... جب کہ قریش کے ۲۲ جوان قتل کئے گئے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قریش نے جنگ کی تیاری مکمل ایک سال تک کی تھی اور اپنی تمام تر طاقت و قوت کو وہ نچوڑ کر لائے تھے ـــــ تب کہیں وہ مسلمانوں کے کل ۳۴ سے زیادہ افراد کو قتل کر سکے۔

جانی قربانی کا یہ شمار یا اس کا دونا یا کئی گنا بھی ہوتا تو ایسا ہے کہ اس کو ہم مارنے والی کی فتح نہیں قرار دے سکتے اور نہ اس کو مار کھانے والے کی شکست کہہ سکتے ہیں....

تو پھر آخر احد کے دن کی وہ کون سی بات تھی جس کو اللہ تعالےٰ نے نزولِ وحی کے وقت مجموعی طور پر اپنے رسولؐ کے غم واندوہ کے سلسلے میں تعلیم کا ذریعہ بنایا....

اور پھر وہ کیا بات تھی جس کے تحت وحی نے اس زمانے کے غزوات اور جنگوں کے مقابلے میں اس جنگ کو امتیازی اور منفرد اہمیت عنایت کی....



میں عرض کرنا چاہوں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو یہ واقعہ پیش آیا، اگر اس کو ہم الگ کر دیں، تو پھر یہاں پر کوئی ایسی چیز باقی ہی نہیں رہ جاتی ہے کہ امیر حمزہؓ کی جائے شہادت کی عبرت کے بجائے اس کو جنگ احد کے اندر پوشیدہ رمز اور اس سے حاصل ہونے والے

درس اور تجربات کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ اس دن اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا: "اگر تم صبر اختیار کرو، تو صبر کرنے والوں کے حق میں یہی بہتر ہے۔" اور رسول اللہؐ نے واقعتاً صبر کا دامن تھام لیا۔ اور اپنے سارے معاملات اور انجام کو اپنے خدا کے سپرد کر دیا.....

پھر کیا ہوا...؟؟

وہ کون سا واقعہ پیش آیا جس کی بدولت آپ کے لیے اس دن صبر کرنے کا مناسب صلہ سامنے آیا ہو، اور جس کی بدولت امیر حمزہؓ اور ان کے شہید رفقاء کا نقد بدل حاصل ہوا ہو؟؟

ایک عجیب واقعہ پیش آیا.....

وہ یہ کہ خالد بن ولید جو احد کے دن گھوڑ سواروں کی کمان سنبھالے ہوئے تھے، ــــ اور جن کے سبب سے تمام اندوہناک معاملات رونما ہوئے تھے اور جنہوں نے اپنے گھوڑ سواروں کے ساتھ پیچھے سے دھاوا کر کے مسلمانوں کی فتح کو سخت امتحان میں تبدیل کر دیا......

ان ہی "خالد" کو ان کی نادر شخصیت اور زبردست قوت کے ساتھ، قدرت نے رسول اللہؐ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں ایک قابل قدر ہدیہ کی شکل میں پیش کیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غزوۂ احد کے صرف دو سال بعد، خالد بن ولید نے ان ہی اہل ایمان کے جلو میں فرمانبردار مومن اور وفاشعار سپاہی کی حیثیت سے اپنے لیے جگہ بنائی جن کے خلاف وہ کل تک نبرد آزما تھے۔

ہاں!..... وہ فنِ حرب میں نادر شخصیت کے مالک تھے۔ اور



اب ذرا تصور کیجیے کہ اگر "یوم حمزہؓ" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان اپنے غیض

وغضب کے اس جوش میں خالد بن ولید پر قابو پا جاتے اور ان کو قتل کر کے مثلہ کر ڈالتے تو پھر وہ نادر شخصیت کہاں حاصل ہوتی جس نے بعد میں قیصر و کسریٰ کے تخت کو ہلا مارا؟

پھر وہ کون شخص ہوتا جس کی فوج کامیابی حاصل کر کے پرانی دنیا کی بساط الٹتی چلی گئی۔

اور قرآن و اسلام کے پرچم کو روئے زمین پر بلند کئے رہی ....!!

پھر وہ کون شخص ہوتا جس کو فتوحات اور محیر العقول کارنامے سرانجام دینے کیلئے قدرت اپنے خزانے سے نکال لائی .....؟؟ کیا اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ سے اس دن نہیں فرمایا تھا کہ: "اگر تم صبر اختیار کرو تو یہ صبر اختیار کرنے والوں کے حق میں بہتر ہوگا" ؟؟

جس کی تعمیل میں رسولؐ اللہ نے صبر اختیار کر لیا تھا.....

_____ یہ تھا وہ خیر جو "یوم حمزہ" اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لایا تھا..... چنانچہ حضرت خالدؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کے ایمان لانے کے بعد اسلامی فتوحات کا ایک سلسلہ بندھ گیا..... یہود دین قیم کے مقابلے میں اپنی ریشہ دوانیوں میں مار کھا گئے، بلکہ مدینہ طیبہ اور گرد و نواح سے اجڑ گئے..... اس جنگ کے فوراً بعد ہی مکہ بھی فتح ہونے والا تھا جب اہل قریش سرنگوں ہو گئے..... جب لشکر شرک کے قائد ابوسفیان..... تیز قدموں سے خیمۂ رسالت کی طرف بڑھے اظہار ندامت کے ساتھ مشرف باسلام ہوئے رضی اللہ عنہ ..... پھر اس کے فوراً ہی بعد پورا جزیرۂ عرب اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو گیا ......اس طرح اللہ کی روشنی پورے طور پر غالب آ گئی۔

یہ روشن اور شاندار مستقبل _ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے حصہ میں دراصل اسی دن کا کرشمہ تھا جب وہ اس عظیم حادثہ اور رنج و محن کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

اسی دن اللہ نے ان کو پکار کر کہا تھا جب کہ ان کے دل غیظ و غضب اور بدلہ لینے کی بیتابی میں بھڑک رہے تھے، کہ: "اگر تم صبر اختیار کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔"

لوگوں نے اس دن اللہ کی پکار پر جبین نیاز خم کر دئے تھے اور اپنے جلیل القدر بزرگ "امیر حمزہؓ" اور اس بھیانک دن کے دوسرے شہید ساتھیوں کو اس کے سپرد کر دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کی تھی۔

ہاں ..... اس مالکِ ذوالجلال کی خاطر اللہ کے رسولؐ نے اسی لمحہ بدلہ لینے کے ارادہ کو خیرباد کہہ دیا۔ اور چچا حمزہؓ کو، جو کچھ ان پر بیتا تھا، ان سب کے ساتھ اللہ کے سپرد کر دیا ..... یہاں تک کہ آپؐ نے جب بعض خواتینِ انصار کو دیکھا کہ وہ امیر حمزہؓ کے غم میں رو رہی ہیں، اور ان کے کارنامے اور مناقب بیان کرتی جا رہی ہیں، شاید ان کو یہ گمان تھا کہ اس سے اللہ کے رسولؐ کا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا، تو آپؐ نے دیکھتے ہی ان کو منع فرما دیا اور دلجمعی کے ساتھ خموشی اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ جب آپؐ نے اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ کو دیکھا کہ اپنے شہید بھائی کی لاش کی جانب دوڑی آ رہی ہیں، اور آپؐ کو اندیشہ ہوا کہ وہ غم واندوہ کو برداشت نہ کر سکیں گے، مغلوب ہو جائیں گی، تو ان کو راستہ ہی سے واپس کر دیا کہ کہیں اللہ کے سپرد کرنے کے اجر میں کمی نہ آجائے۔

اس موقع پر آپؐ نے ان کے لڑکے حضرت زبیرؓ بن عوام کو بلایا اور فرمایا کہ انکو واپس لے جاؤ تاکہ وہ اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکیں۔

اللہ کے رسولؐ ٹھہرے رہے (آپؐ اور آپؐ کے آل واصحاب پر درود و سلام ہو) رک کر حضرت زبیرؓ اور ان کی والدہ حضرت صفیہؓ کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس کی طرف

کان لگائے رہے۔ آپؐ نے ان کو کہتے ہوئے سنا کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ واپس ہو جائیں۔"

پھر حضرت صفیہؓ کا جواب بھی آپؐ نے سُنا' وہ کہہ رہی تھیں:

"میں واپس نہیں جاؤں گی' مجھے خبر ملی ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کر دیا گیا ہے"......؟؟

" اور یہ اللہ کی راہ میں ہوا ہے۔ تو پھر اللہ کے لئے ہم کو راضی رکھنے والی چیز اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی؟

"میں بھی ان کو اللہ کے سپرد کر دوں گی اور انشاء اللہ میں صبر کروں گی۔"

تعزیت کے کتنے حسین کلمات تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ پھول گیا۔ آپ نے حضرت زبیرؓ کو پکارا:

"زبیر' چھوڑ دو' ان کو جانے دو۔"

وہ گئیں' اپنے بھائی کو سلام کیا' ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کی اور سلام کر کے چلی آئیں۔

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جب حضورؐ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار دعا فرما دی تو وہ دفن کر دیئے گئے۔...... پھر حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بازو میں شہداء کی لاشیں لاکر رکھی جاتی رہیں اور آپؐ ایک ایک کر کے سب کے لیے دعا فرماتے رہے' ساتھ ہی ہر ایک دعا میں امیر حمزہؓ کو شامل فرماتے رہے۔

جب اس عظیم مردِ آہن کو اپنے پاکباز ساتھیوں کے درمیان ابدی خواب گاہ میں سُلا

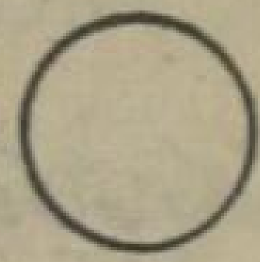
دیا تو آپؐ اپنے اصحاب رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے ساتھ مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے تاکہ اب
اس کے بعد کے امور کو پہلی فرصت میں انجام دے لیں۔ اور اسلام کی راہ میں آنے والی نئی
ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔

یومِ حدیبیہ

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ
فَتْحًا قَرِيبًا

وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے، اس
لئے اس نے (تمہارا خواب پورا ہونے سے) پہلے ہی
یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی

(سورۃ فتح : ۲۷)



وہ کون سا دن ہو سکتا ہے جو انتقامی جذبات کے مظاہروں‘..... خوشخبری کے ارشادات ... واضح علامتوں اور اشارات کا حامل ہونے کے لحاظ سے

اس دن پر بازی لے جائے ..... ؟؟!

رسولؐ خدا اور ان کی رسالت کے جوہر کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کے اوصاف کو بھی نکھارنے میں شاید اسی دن کا کارنامہ سب سے نمایاں ثابت ہوگا۔ کیوں کہ ہمارے علم میں دوسرا کوئی دن ایسا نہیں ہے جس نے صحابہ کرامؓ کے ایمان کو اتنی سخت آزمائش میں ڈالا ہو ..... اور نہ ہمارے علم میں کوئی دوسرا دن ایسا ہے جس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت کو سراپائے سلامتی و رحمت کی حیثیت سے اس قدر اجاگر اور اسلام کی حقیقت کو امن و انصاف کے بہترین گہوارہ کی شکل میں اتنا نمایاں کیا ہو جتنا اس دن نے کیا .....

اسی طرح وہ ناپیدا کنار مسافت جو علمِ الٰہی اور معرفت مخلوق کے درمیان ..... حکمتِ خالق اور حکمتِ بندگانِ خدا کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہے، اس دن واضح صورت میں سامنے آگئی اور اتنے زور دار انداز میں پیش آئی کہ عقل حیران ہے۔

”یوم حدیبیہ“ کی امتیازی خصوصیات ہمیں غزوۂ خندق کے پیچھے سے جھانکتی نظر آتی ہیں۔ اور وہیں سے اس کا سراغ ہمیں ملنے لگتا ہے ..... یہ وہی جنگ تھی جس میں اہل قریش اپنی ساری قوت نچوڑ دینے کے لیے تیار ہو آئے تھے۔ ساتھ ہی ان کی للکار پر یہود بھی اپنے حلیفوں کو لے کر اس جنگ میں حصہ دار بن گئے تھے۔ قریش کے لوگوں نے چڑھائی کر کے مدینہ کے ایک ایک گھر پر جنگ چھیڑنے اور چن چن کر مسلمانوں کو بے رحمی کا شکار بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

مسلمان اس دن ایک بھیانک خطرہ میں گھر گئے تھے۔ اچانک قریش اور اس کے حلیفوں

کے لشکر نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اور مدینہ کا پرسکون شہر باہر سے محاصرہ کیا جا چکا تھا، ساتھ ہی داخلی طور پر بھی بنی قریظہ کا یہودی قبیلہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

مسلمان اس دن اپنے آپ کو آزمائش کے جس دہانے پر موجود پا رہے تھے اس کی مثال کے لئے قرآن کریم کی ان آیات سے بہتر الفاظ نہیں ملیں گے جو اس بھیانک خونی منظر کی تصویر کشی کر سکیں۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا......	یاد کرو جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے، اور جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے ......
هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا... (سورہ الاحزاب ۱۰)	اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔

لیکن آزمائش کی تاریکیوں سے فتح و کامرانی کا نور چمکتا ہوا نمودار ہوا ..... اور ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے مستقبل کی بشارتیں ضیاء پاش ہوئیں۔

چنانچہ جب اللہ کے رسول اور اہل ایمان مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنے میں مصروف تھے، اس وقت ایک سخت چٹان نکلی جس کو اٹھانا اس جگہ پر صحابہ کے لیے بھاری پڑ رہا تھا۔ رسولِ خدا نے اس کو اپنے کدال سے ذرا اوپر اٹھایا، پھر اس پر تین چوٹیں دیں۔ ہر چوٹ پر چٹان ٹوٹتی چلی گئی اس کی ایک ایک چنگاری سے بجلی جیسی چمک نکلتی تھی۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے "اللہ اکبر" کا کلمہ بلند ہوا اور آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس بھاری پتھر کی جگہ اب ایک کشادہ زمین حاصل ہو گئی تھی جہاں سے آئندہ کل اور اس کے بعد کے دن اسلام اور قرآن کا پرچم لہرانے

والا تھا۔ رہا معاملہ قریش اور اس کے حلیف قبیلوں بنی کنانہ، تہامہ اور غطفان کا، تو اللہ تعالےٰ نے ان کو یکسر مذاق بنا کر رکھ دیا۔ اور ان پر ایک رسوا کن بلا نازل کر دی۔ کون سی رسوا کن بلا.....؟!

اللہ تعالےٰ کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ اس دن کو اپنے دین اور اپنے رسولؐ کے لئے سراپا معجزہ بنا دے۔ چنانچہ جنگ تو محض برائے نام ہی ہوئی..... البتہ قدرت نے اپنا ایک واضح معجزہ بھیج کر ان جنگی سرکشوں سے اپنا حساب چکا لیا۔

ہوا یہ کہ اگلی چند راتوں میں ٹھنڈک اس طرح تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی کہ پالا پڑنے لگا، اسی کے ساتھ باد سموم کی مانند ایک تیز و تند جھونکا ایسا چلا کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے۔ سواری کے جانور ہلاک ہو گئے اور ان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ ان حالات کو دیکھ کر قائدِ قریش ابو سفیان نے اپنے منتشر لشکر سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"اے گروہ قریش! اب تمہارے ٹکنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے تمہارے چوپائے۔ گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور بنو قریظہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ہم لوگ ہوا کے جھونکوں کی لپیٹ میں اس طرح آ گئے ہیں کہ ہانڈی تک چڑھانے کا موقع نہیں ہے، اور نہ آگ ہی ٹھہر سکتی ہے..... پھر ہمارے خیمے بھی زمین پر نہیں تھمتے ہیں۔ .... لہٰذا اب تم لوگ چل چلو، میں بھی چلا۔"

اس طرح نظروں نے دیکھا کہ فخر و غرور میں جھومتا ہوا لشکر ذلت و رسوائی کیساتھ پسپا ہو گیا۔ اس غزوہ میں کسی قسم کی باقاعدہ جنگ سے سابقہ پیش نہیں آیا..... اسی بات نے ظاہر کر دیا کہ وہ ایک معجزہ اور صرف معجزہ تھا جس نے ان کے "عظیم الشان فتح" کے تصور کو باطل کر کے رکھ دیا.... اس موقع پر مسلمانوں نے خندق کھودنے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ پھر دو انفرادی مقابلے

ہوئے۔ ایک مقابلے میں ایک مشرک مارا گیا اور دوسرے میں مقابل شخص بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک اور معاملہ اس وقت روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ایک چال کا تھا جس کے نتیجے میں نُعیم بن مسعودؓ نے اس معاہدہ کو مشکوک اور بے وقعت بنا کر ان کی سازش کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا جو قریش اور بنو قریظہ کے یہودیوں کے درمیان چلا آ رہا تھا۔

اگر ان تین واقعات کو ہم مستثنیٰ کر دیں تو پھر مسلمانوں کو خونریزی، طاقت اور جنگ سے گویا کوئی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ اور اس مقابلے کو جیتنے کے لئے کوئی بشری کوشش صرف ہی نہیں ہوئی بلکہ یہاں تو صاف ایک پر اسرار معجزہ کارفرما نظر آتا ہے جو اہل ایمان کو یہ سبق ذہن نشین کراتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سراسر حق پر ہیں..... اسلام ایک حق ہے..... اور اللہ جو کچھ کرنا چاہے، اس پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے......!!



میرے خیال میں "یوم حدیبیہ" کی سب سے پہلی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اس غزوۂ خندق کے پیچھے پیچھے آیا تھا جس نے مشرکوں کی دلچسپ اور مکمل شکست اور مسلمانوں کے شاندار معجزاتی فتح کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر قادر تھے کہ آمادۂ پیکار آنے والے اس لشکر کا واپسی کے وقت تعاقب کر کے اس پر حملہ کر دیتے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں کہ جنگ کرنا آپؐ کا مشن نہیں تھا..... بلکہ اس کی حیثیت محض ضرورت کی تھی..... چنانچہ جب دشمن لوٹ گئے تو آپؐ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے اس اصل مشن میں لگ گئے جس کو بایں الفاظ بیان کیا جا سکتا ہے: "شہادت دینے والے، خوش خبری سنانے والے، ہوشیار کرنے والے،

اللہ کی طرف اس کی مرضی سے دعوت دینے والے اور روشن چراغ"

جی ہاں! ..... آپؐ نے کبھی جنگ کی آرزو نہیں کی، نہ اس کے وقوع کے لئے کبھی سعی فرمائی اور نہ اس کی جانب کبھی راغب ہوئے بلکہ آپؐ تو برابر اپنے ساتھیوں کو یہی سمجھاتے رہے کہ :۔

لَاتَتَمَنَّوْ لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسلوا اللہ العافیۃَ وَاِذَا لَقِیْتُمُوْھُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الجنۃَ تحت ظِلَالِ السُّیُوفِ

دشمنوں سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ تعالےٰ سے عافیت ہی کے طالب رہو، لیکن ہاں، اگر ان سے سامنا ہو جائے تو ڈٹ جاؤ۔ اور یاد رکھو کہ جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

آپؐ نے جنگ کی کبھی خواہش نہیں فرمائی کیوں کہ آپؐ رسول تھے، کوئی جنگجو نہیں تھے۔ لیکن جب باطل نے اپنی سرکشی اور غرور کو آپؐ کے اوپر مسلط کرنا چاہا تو اس وقت جنت آپؐ کی تلواروں کے سائے میں تھی، اور آپؐ کی آرزو یہ ہوتی تھی کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں..... پھر زندگی ملے، پھر شہید ہو جاؤں..... پھر زندگی ملے، پھر شہید ہو جاؤں.....!!

یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ایک شکستہ لشکر پر دھاوا کرنے سے احتراز فرمایا۔ حالانکہ ـــــ اگر آپؐ تعاقب فرماتے تو ـــــ ان کو تباہ و ویران کر دینا آپؐ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

اسی طرح آپؐ کے پاکیزہ اور اعلیٰ ظرف کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ فتح کی شان و شوکت یا فخر و غرور کا مظاہرہ ہو۔ آپ کی تمنا اتنی ضرور تھی کہ اہل قریش اس سبق کو اپنے لیے فالِ نیک سمجھیں، اس معجزہ کے سامنے جھک جائیں، اپنے اسلحے پھینک ڈالیں اور جنونِ جنگ اور ادّعاءِ کبر سے باز آجائیں۔

نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بیت اللہ شریف، مکہ کی کشش زور مارنے لگی۔ چنانچہ آپؐ وہاں کا سفر کرنے پر راغب ہوئے..... ماہ رمضان کا چاند دیکھا جا چکا تھا۔ ذیقعدہ میں

مسجد حرام میں جاکر عمرہ وزیارت کرنے کے قصد سے آپؐ نکل کھڑے ہوئے۔ تقریباً ایک ہزار صحابہ کرامؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔

جب نکلے تو احرام کا لباس جسم پر تھا اور قربانی کے جانور آگے آگے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ آپؐ تصادم کے ارادہ سے نہیں نکلے ہیں۔ اب ذرا یہاں ٹھیریئے، اس نادر منظر کا مشاہدہ ذوق و شوق کے ساتھ کر لیجئے۔ پھر آگے بڑھیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا کوئی موقع اہلِ قریش نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان جنگوں میں خود ان کو چرکے لگتے رہے۔ ابھی حال ہی میں محض دو ماہ قبل آپؐ کے خلاف دس ہزار جنگی جوانوں کو لئے وہ متحد ہو کر آچکے تھے تاکہ مدینہ کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دیں ..... یہ اور بات ہے کہ اس بار بھی ان کو شکستہ حال ہی واپس آنا پڑا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ اس بار ان کے لشکر اور ان کے عناد کو جنگ سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا۔ لیکن نزول عذاب سے جو شکستہ حالی ان کے حصہ میں آئی تھی اس سے ان کے اندر حسد و عداوت کی چنگاری بھڑکنے لگی تھی۔ ان سب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک ہزار نفوس یا اس سے بھی کم تعداد کے ساتھ مکہ جانے کا قصد کرکے ہتھیار گرائے، طاقت کے مظاہرے کو بالائے طاق رکھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔

یہاں تو اللہ تعالیٰ پر مطلق بھروسہ کا معاملہ تھا..... وہ بھی سچے رسول کا بھروسہ جو اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ منصب رسالت کے لئے آپؐ انتخاب الٰہی ہیں۔

یہاں تو اس شخص کا معاملہ تھا جو ہمیشہ امن و سلامتی کی خاطر دوستی استوار کرنے کا خواہاں رہتا تھا۔ نزاع کی صورت میں حسن ظن کو راہ دیتا تھا اور اپنے فریق کی ہدایت کا آرزومند رہتا تھا

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اس سرزمین کے شوق دیدار میں نکل پڑے تھے جس نے ان کے بچپن اور جوانی کے ایام دیکھے تھے۔ یہ لوگ اس بیت محترم کی جانب قدم بڑھا رہے تھے جس کو اللہ تعالٰے نے نوعِ انسانی کے لئے مرکز و محور اور جائے امن بنا دیا تھا..... چلتے چلتے عسفان پہنچے اور مکہ مکرمہ کی مسافت صرف دو مرحلوںؒ کی رہ گئی تو اس کاروانِ حرم کو معلوم ہوا کہ ان کی آمد کی خبر اہل قریش کو مل چکی ہے اور ان کا ایک ایک فرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو داخل ہونے سے بزور شمشیر روکنے کے لئے مکہ کے تمام راستوں پر نکل آیا ہے۔

اس سنگین معاملہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کیا تھا؟ ——— یہ کہ :-

کتنے بدبخت ہیں یہ اہل قریش......

جنگ کی چکی میں پسنے کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

ان کا کیا بگڑ جائے گا اگر یہ میرے اور تمام اہل عرب کے درمیان فیصلہ کے لیے راستہ چھوڑ دیں اگر اہل عرب مجھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں تو یہ ان لوگوں کے منشا کے بھی عین مطابق ہے۔ اور اگر اللہ نے مجھ کو ان پر غالب کر دیا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ مجھ سے تعرض کرنے سے باز نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو قوت حاصل ہے۔ لیکن اہل قریش نے کیا سمجھ رکھا ہے؟؟

خدا کی قسم! میں اس مشن کی خاطر جس کو لے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے، اس وقت تک جنگ کرتا رہوں گا جب تک یہ نہ ہو لے کہ یا تو اللہ اس مشن کو غالب کر دے یا یہ پیچھے لگے رہنے والے لوگ، بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں.....''

قریش کی جماعتیں جس راستے پر تھیں، کسی قسم کے ٹکراؤ کے امکان سے بچنے کے لیے آپؐ نے

ؒ ایک مرحلہ تقریباً ۱۵ میل کا ہوتا تھا۔ (مترجم)

اس کشادہ اور ہموار راستہ کو چھوڑ دیا اور ایک دشوار گذار راستہ کو اختیار فرمایا جو نہایت تکلیف دہ تھا، اتنا کہ تلوؤں سے خون نکل آتا تھا..... اس راستہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ کے قریب ہی حدیبیہ کے مقام پر پہونچے... مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا اور خیمے نصب کئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی جانب رخ کرکے کھڑے رہے۔ ترچھی نظروں سے گھرے ہوئے راستوں کی طرف دیکھتے رہے۔ اور فرماتے رہے :۔

"آج اہل قریش نے مجھ سے حسن سلوک پانے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔ الّا یہ کہ میں خود ان کے لئے اسے روا رکھوں" !!

کسی بشر کے اندر رحمت کے جذبے کا جس حد تک تصوّر کیا جا سکتا ہے، آپؐ کی رحمت اس دن ان تمام حدود سے تجاوز کر گئی..... وہ پھیلتی اور دراز ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کے حصّے میں بھی پہونچ گئی..... اس دن آپؐ کے عتاب کا نشانہ بننے کے بجائے وہ آپؐ کی شفقت و ہمدردی سے فیضیاب ہوتے رہے..... آپؐ تو ان سے یہی توقع کرتے رہے کہ وہ عقل سے کام لے کر نرمی کو راہ دیں گے اور اللہ کا کلمہ لوگوں تک پہنچانے اور اس کے بندوں کو راہ ہدایت دکھانے کے لئے آپؐ کا راستہ چھوڑ دیں گے..... حد تو یہ ہو گئی کہ وہ جب بھی جنگ پر مُصر ہوئے تو جنگ کے سے حالات ہو جانے کے باوجود آپؐ ان کے ساتھ شفقت ہی فرماتے رہے۔ تاکہ وہ باز آجائیں۔ مگر وہ تھے کہ یوم خندق کی رسوائی کے داغ سے بے قابو ہو رہے تھے۔ اور جیسا کہ ہم نے ابھی آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات میں دیکھا، جب بھی وہ لوگ دفور جذبات میں اگر لڑنا چاہتے تھے تو آپؐ کی تمنا یہی ہوتی تھی کہ وہ جنگ نہ کریں...

اتنا کامل انسان ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے...؟؟!!

ادھر بُدیل بن ورقاء کی سرکردگی میں بنی خزاعہ کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ کی تشریف آوری کی غرض دریافت کی..... آپؐ نے فرمایا کہ میں بیت اللہ شریف کی زیارت اور اس کی عزت و تعظیم کے مناسک ادا کرنے کی غرض سے آیا ہوں، جنگ کرنے کے لئے ہرگز نہیں آیا ہوں۔

اس وفد نے واپس جاکر اہل قریش کو بیت اللہ شریف کی زیارت کی غرض سے آنے والی جماعت کے سامنے اسلحہ بند کھڑے ہونے پر ملامت کی ——— لیکن قریش کے لوگ اپنے سرداروں کے سر پر سوار ہو گئے اور فی الحال مسلمانوں اور ان کے رسولؐ کو مکہ میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ جس نے مطالبہ کیا کہ آپؐ اپنے لوگوں کو لے کر اس سال واپس ہو جائیں ....
رسولؐ اللہ نے اس کے جواب میں اس نمائندہ سے وہی فرمایا جو بدیل سے فرمایا تھا۔

اہل قریش نے پھر ایک نمائندہ بھیجا۔ اس نے آکر جو یہ دیکھا کہ جانور جو وادی میں پھیلے ہوئے چر رہے ہیں، ان کی گردنوں میں قربانی کے پٹے لگے ہیں، تو وہ سمجھ گیا کہ رسولؐ اللہ اور انکے لوگ عبادت اور قربانی کے سوا کسی اور غرض سے نہیں آئے ہیں۔ چنانچہ اہل قریش کے واپس جانے کا پیغام رسولؐ اللہ تک پہنچانے میں اس کو شرم محسوس ہوئی۔ وہ راستہ ہی سے لوٹ گیا اور جاکر اہل قریش سے کہا :- کیا بیت اللہ میں جانے سے اس شخص کو روکا جائے گا جو اس کی تعظیم کرنے آیا ہو.....؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم تو ضرور ہی محمدؐ کا راستہ

چھوڑ دو اور ان کو اپنی غرض پوری کرنے دو۔ ورنہ میں اپنے طور پر اُن تمام قبیلوں سے علٰحدہ ہو جاؤنگا"

اہل قریش کا غرور اب بھی کم نہ ہوا۔ چنانچہ پھر ایک تیسرا نمائندہ بھیجا..... جس نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ :۔

"..... قریش کے لوگ سامنے موجود ہیں، بچے والیاں تک ان کے ساتھ نکل کر آگئی ہیں چیتے کی کھال اوڑھ کر انھوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ ان کے رہتے ہوئے کبھی کوئی بے دین مکہ میں داخل نہ ہوگا۔"

وہ دیر تک رسول اللہؐ کے سامنے اپنی بات کہتا رہا..... اس گفتگو کے دوران جب وہ ایک بار حضورؐ کی ریشِ مبارک کے پاس ہاتھ لے گیا، تو قریب تھا کہ صحابیِ رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اس پر اپنی تلوار چلا دیتے، حضورؐ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور زبان سے اللہ اکبر کی صدا نکلی اور آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے مغیرہؓ کو اشارہ فرمایا کہ غصہ پر قابو پائیں اور خاموش رہیں۔ چنانچہ وہ باز رہے..... !!

اہل قریش کا یہ نمائندہ عروہ بن مسعود حیرت زدہ واپس ہوا اور اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا اے گروہِ قریش ! میں کسریٰ کے پاس اس کے دربار میں گیا ہوں... قیصر کے دربار میں بھی گیا ہوں..... اور نجاشی کے پاس بھی اس کے دربار میں گیا ہوں۔ مگر خدا کی قسم، ان میں سے کسی کی وہ قدر و منزلت اس کی قوم میں نہیں دیکھی جو قدر و منزلت میں نے محمدؐ کی ان کے ماننے والوں میں دیکھی ہے۔

میں نے ان کے ماننے والوں میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے، جو ان کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا، اپنی رائے پر غور کر لو۔"

وہ دن بھر قریش کے گرد گھومتا رہا۔

ابھی ان کے شیوخ غور و فکر کر ہی رہے تھے کہ اسی اثنار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ان کے پاس پہنچے۔ وہ لوگ ان کو نظر انداز کرتے رہے۔ آخر ان پر احمقانہ غصہ کا اظہار کرنے لگے۔ جس اونٹنی پر وہ سوار ہو کر آئے تھے اس کی دم کاٹ ڈالی اور خود ان سے بھی الجھ گئے' ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ تو احابیش[1] تھے جنہوں نے روک تھام کی اور صحیح و سالم رسول اللہ کے پاس واپس جانے دیا۔

نبیؐ نے اس واقعہ پر نہ تو شور و ہنگامہ کیا اور نہ مایوس ہوئے۔ آپؐ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو بلایا اور قریش کے پاس بھیجا کہ ان کے شرفار اور عام لوگوں کو جا کر سمجھا دیں کہ آنحضرتؐ جنگ کی غرض سے نہیں آئے ہیں..... بلکہ عمرہ اور زیارتِ بیت اللہ شریف کی نیّت سے حاضر ہوئے ہیں...

ایسا انسان کون ہو سکتا ہے کہ اس قِسم کی سرکشی اور طاقت نمائی کے رویّے پر بھی آپے سے باہر نہ ہو' اور اس کے صبر و ضبط کی ڈوری اس طرح طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے.....؟؟

لیکن اللہ کے رسولؐ تھے کہ ہر قسم کی نفسانیت سے پاک و مبرا ہو کر اپنے رب کی اطاعت و رضا جوئی پر کمر بستہ تھے۔ آپؐ درگذر کے حسین مظاہرے اور سلامتی کی جستجو کو چھوڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے خواہ آپؐ کے صاف ستھرے موقف کو کتنا ہی غلط سمجھا گیا ہو۔

حضرت عثمانؓ گئے اور رسولِ خداؐ کا پیغام پہنچا دیا..... مگر اہل قریش نے معقولیت کے ہر پیغام کو ٹھکرا دیا..... چنانچہ صرف حضرت عثمانؓ کو ذاتی طور پر اجازت دی کہ آپؓ جا کر بیت اللہ شریف کی زیارت اور طواف جب چاہیں کریں..... لیکن بھلا حضرت عثمانؓ کے لئے یہ بات کب قابلِ

---

[1] یعنی قریش کے وہ حلیف قبائل جو حدیبیہ کے پاس آباد تھے (مترجم)

قبول ہوسکتی تھی ؟ انھوں نے ان کی اس پیش کش یہ کہہ کر رد کر دی کہ :۔

"جب تک رسولِ خدا طواف نہ کریں، میں تو نہیں کر سکتا۔"

اہل قریش نے ادھر ان کو باتوں میں پھنسا کر روکے رکھا۔ اور ادھر مسلمانوں کی طرف یہ سرگرم افواہ پھیلا دی کہ حضرت عثمانؓ قریش کے ہاتھوں شہید کر دئے گئے

○ ○ ○

افواہ .....

اور عثمانؓ کی شہادت .....؟

کیا یہ کوئی موقع تھا اور کیا یہاں کوئی مناسبت تھی کہ اللہ تعالےٰ نے ان دونوں لحاظ سے اپنے رسولؐ کو کسی افواہ کا شکار ہونے کے لئے چھوڑے رکھا.....؟

اور جب وحی نے اللہ کے رسولؐ کو خطرات سے گھرے ہونے کے اس موقع کو یقینی علم فراہم کرنے کے لئے مناسب نہیں پایا تو اس کا اور کون سا موقع مناسب ہو سکتا تھا.....؟

یہ ایک شبہ ہے جو عجلت پسند قاری کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے، لیکن تھوڑے تأمل سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس موقع پر وحی نے رسول اللہؐ کو برکتِ یقین سے محروم نہیں رکھا....

یہ بات درست ہے کہ وحی عین اسی لمحہ نہیں آئی جو یہ خبر دیتی کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ بالکل زندہ و محفوظ ہیں..... کیوں کہ اس پورے معاملے کے سلسلے میں قبل ہی رسول اللہؐ کو انجام کار کی بشارت دی جا چکی تھی اور رویائے[1] صادقہ کی شکل میں اس پورے موقع کو واضح طور پر آپؐ کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا کہ آپؐ مسجدِ حرام میں پُرامن طور پر داخل ہو رہے ہیں اور مدینہ منوّرہ سلامت واپس تشریف لا رہے ہیں....

---

[1] یعنی سچے خواب، جو غنودگی کے عالم میں اللہ تعالےٰ نبیوں کو دکھایا کرتا ہے، جو بیداری کی دنیا میں حقیقت بنکر سامنے آتے ہیں۔ (مترجم)

بڑے بڑے رسولوں کے ساتھ وحی الٰہی ابجد کے قاعدے پر تعلیم دینے یا معاملہ کرنے کی صورت اختیار نہیں کیا کرتی ہے بلکہ وہ ان کو بڑے بڑے حادثات اور مسائل میں بھی بشری مشقت اور حصولِ مقصد کی راہ کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ ان کا سرمایہ دراصل وہ زبردست یقین ہوا کرتا ہے جو وحی ان کے اندر اسی وقت پیدا کر دیتی ہے جب ان کے منتخبِ الٰہی ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ وعدہ ان کی قوتِ قلب اور جوشِ عزائم کا ذریعہ بنتا ہے۔ جو رسولوں کی مدد کے لئے اللہ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ کے رسولؐ حدیبیہ کے اس موقع پر بھی اس بات کے محتاج نہ تھے کہ ان کے یقین کو بڑھانے والی کوئی صورت سامنے آئے کیوں کہ وہ اللہ جو اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے، آپؐ اور آپ کے اصحاب کی اس راہ میں مدد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا..... اس بنا پر ایک عام یقین تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر موجود تھا ہی جس کی آپؐ کو اپنے دائرۂ کار میں ضرورت تھی۔

آپؐ نے رؤیائے صادقہ دیکھ ہی لیا تھا ــــــــــ اور انبیاء کے خواب سچے ہوا کرتے ہیں ــــــــ کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ جا کر اور حضرت عثمانؓ جیسے کسی بڑے صحابی کے قتل جیسا کوئی اہم حادثہ پیش آئے بغیر مسجد حرام کی زیارت کرنے والے ہیں۔

اس طرح آپؐ اس گرما گرم افواہ کے باوجود مطمئن تھے اور معاملہ کی حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔

..... البتہ اس موقع پر قدرت نے تھوڑا سا مشکوک اور لاعلمی کا معاملہ اس افواہ کے ضمن میں پیدا کر دیا تھا، اگر رسول اللہؐ پر اس کا کوئی معمولی سا اثر تھا تو ایسا ہونا قدرتی تھا تاکہ حادثات پر قابو پانے اور آزادیٔ عمل سے کام لے کر بشری کوشش کو روبعمل لانے کا موقع ملے..... انبیاء علیہم السلام کو قیادت کا مقام اسی طریقہ پر ملا کرتا ہے اور انسانی دنیا پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں.....

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ رسول اللہؐ نے اس صورتِ حال کا مقابلہ قائدانہ ہوش مندی اور انبیائی اطمینانِ قلب کے ساتھ کیا۔

آپؐ نے جس وقت اپنے قاصد کی زندگی کے متعلق دشمنی کی افواہ سنی تو آپؐ نے یہ سمجھا کہ اب قریش نے آپؐ کو مقابلے پر نکلنے کا قطعی حق دے دیا ہے۔ اس لئے آپ نے صحابہ کرامؓ کو ایک بیعت کے لئے آواز دی جس کو قرآن پاک نے "بیعت رضواں" کا نام دے کر دوام عطا کر دیا۔

جو کچھ آپؐ نے خواب میں دیکھا تھا اور جس بات کا وعدہ کیا گیا تھا آپؐ کا دل اس پر پوری طرح مطمئن تھا۔ چنانچہ اس افواہ کے واقعہ کے سلسلے میں آپؐ کا احساس یہی تھا کہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے جب صحابہ کرام سے بیعت لی اور ان لوگوں نے آپؐ کے ہاتھ پر قریش سے مقابلہ کرنے کی بیعت کی تو آپؐ نے اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ:-

"یہ ہے عثمان کی بیعت"

مطلب یہ تھا کہ آپؐ نے بذاتِ خود بیعت لی ہے اپنے صحابی عثمانؓ کی جانب سے۔ اس کی تشریح یوں سمجھئے کہ آپؐ حضرت عثمانؓ کی جانب دیکھ رہے تھے...... غیر موجودگی کی صورت میں، نہ کہ میت یا لاپتہ کی شکل میں...... لہٰذا ان کی طرف سے یہ بیعت ایک زندہ شخص کے حق میں بیعت کے مفہوم میں تھی۔

جب تاریخ میں ہم یومِ حدیبیہ کے واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ شاندار اسباق دینے والا ایک عظیم الشان مدرسہ نظر آتا ہے.....

● یہ مسلمان اللہ کی حکمت سے چمٹے رہنے اور اس کے حکم کے آگے سپر ڈال دینے کے ہر فرض اور ہر تقاضا سمیت اسلام کی امانت کا بار اٹھانے کے پوری طرح اہل ہیں۔ اس بات کا مظاہرہ

اس دن بڑی خوب صورتی سے ہوگیا.....

- اور اسلام کی یہ حیثیت کہ یہ دینِ ہدایت ہے، دین جبر نہیں ہے.....اور یہ کہ اس کا طریقہ کار حجت و دلیل کا ہے، زورِ شمشیر کا نہیں ہے..... پسند و اختیار کرنے کا ہے، مسلط کیے جانے کا نہیں ہے، اس کی وضاحت بھی اس دن روزِ روشن کی طرح ہوگئی.....

- اور یہ کہ قوتِ نفس کی گرم رفتاری اور تجربہ کاری کا سب سے بڑا عامل جو مسلمانوں کے ایمان کے اندر ابھرتا ہے، وہ اس دن خاطر خواہ طور پر کارفرما نظر آیا۔ اور اس قوت کے ذریعے تذبذب اور ضعف کے تمام آثار کا خاتمہ ہوگیا۔ اور سربلندی و استحکام کے اعلیٰ درجات تک رسائی سہل ہوگئی۔



اس دن کے ابتدائی لمحات ایسے واقعات سے بھرے پڑے تھے جن کا ظہور پذیر ہونا قدرتِ حکیمانہ کو منظور تھا تاکہ ان کے ذریعے ایمان کی وہ رونق خوب پختہ ہوجائے جو اصحابِ رسولؐ کے اس مبارک گروہ کے دلوں میں چمک رہی تھی۔

لیکن یہ واقعات سمٹ کر جوش و جذبات کی انتہا کو پہونچ گئے جب اہل قریش نے اپنا آخری نمائندہ "سہیل بن عمرو" کو بنا کر رسول اللہ کے ساتھ معاہدہ کر لینے کی غرض سے بھیجا۔ اس معاہدہ کے پیچھے جو مقصد تھا وہ یہ تھا کہ اس بار آخری طور پر ان لوگوں کو مکہ میں داخل ہونے سے باز رکھا جائے تاکہ اہل عرب یہ نہ کہہ سکیں کہ رسولؐ اللہ اور ان کے ماننے والے بے دین لوگ مکہ میں داخل ہوگئے اور اہل مکہ روک نہ سکے۔

اس بات کے علی الرغم کہ سہیل اپنے مشن میں پورا پورا کامیاب ہوگیا، اس کامیابی کا سہرا خود اس کے سر نہیں جاتا ہے کیوں کہ یہ کامیابی خود اس کی اپنی بدولت ہوئی ہے، ایسا ہرگز نہیں تھا...

بلکہ درحقیقت اس کا سہرا اوّل تا آخر خود رسول اللہؐ کے سر جاتا ہے کیوں کہ آپؐ خونریزی سے بچنے کی طرف مائل تھے۔ اسی بنا پر گویا آپؐ نے اہل قریش کو اپنی ضلالت و حماقت اور گھمنڈ سے مغلوب رہنے اور بہرصورت اپنا سر اونچا رکھنے کا موقع عنایت فرما دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام محبت و سلامتی کا دین ہے..... پاکبازی و رحمدلی کا دین ہے۔



سہیل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھا۔ اور آپؐ کے گرد صحابہ کرامؓ امید افزا صلح کی شرطیں یاد کرنے کے لئے گھیرا باندھے بیٹھے رہے۔

جب بھی ایک شرط سامنے آتی، تو صحابہؓ کرام کے سینے ابلتی ہانڈیوں جیسے جوش سے بل کھانے لگتے..... کیوں کہ ساری شرطیں مسلمانوں کے برخلاف قریش کے مفاد میں جا رہی تھیں۔

اس گفتگو کے بعد ایک کاغذ پر معاہدہ رقم کرنے کا وقت آیا...... آیئے اس واقعہ کو ہم ان لوگوں کی زبانی سنیں جو اس موقع پر موجود تھے:۔

"اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ ابن ابی طالب کو بلایا اور حکم فرمایا کہ:۔ لکھو، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے)

سہیل نے کہا: میں اس کلمہ سے واقف نہیں ہوں... اس لئے لکھو بِاسْمِكَ اللّٰھُمَّ (اے اللہ تیرے نام سے)......!!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ سے کہا لکھو: بِاسْمِكَ اللّٰھُمَّ......!!

پھر فرمایا: لکھو، یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمدؐ رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان مصالحت ہوئی ہے۔

سہیل نے پھر کہا: اگر میں یہ بات جانتا کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں تو آپؐ سے جھگڑا ہی نہیں کرتا اس لئے لکھئے اپنا نام اور اپنے والد کا نام.....

چنانچہ رسول اللہﷺ نے علیؓ سے فرمایا: لکھو، یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمدؐ بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان مصالحت ہوئی ہے..... دونوں نے اس بات پر صلح کی کہ دس سال تک لوگوں کے درمیان جنگ موقوف رکھی جائے گی، اس مدت میں لوگ امن کے ساتھ رہیں گے، کوئی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ اور اس بات پر کہ قریش کا کوئی شخص اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا، تو وہ اس کو واپس کر دیں گے..... جب کہ محمدؐ کا کوئی ساتھی قریش کے پاس آئے گا تو اس کو واپس نہیں کیا جائے گا..... اور عیب لگانے سے باز رہنا ہوگا ـــــ یعنی باہمی شر کی باتوں سے احتراز کیا جائے گا۔ رسلّ وغلّ ـــــ یعنی چوری وخیانت ـــــ ممنوع ہوگی۔ اور جو شخص محمدؐ کے ساتھ معاہدہ کرنے کا خواہش مند ہوگا، وہ معاہدہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو شخص قریش کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہئے وہ کر سکے گا۔"

اور تم اس سال واپس جاؤ گے، مکہ میں ہمارے سامنے داخل نہ ہوگے۔ البتہ اگلے سال مکہ سے ہم نکل جائیں گے اور تم اپنے لوگوں کے ساتھ داخل ہو سکتے ہو، لیکن صرف تین دن ٹھیرو گے۔ تمہارے پاس سواری کا اسلحہ تو ہوگا مگر تلواریں نیام میں ہوں گی۔ اس صورت کے بغیر تم داخل نہیں ہو سکتے ہو"



ہم نہیں سمجھتے کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اتنا سخت اور جان لیوا موقف اس کے علاوہ کبھی گوارا کیا ہوگا..... اور نہ مسلمانوں کو ایسے موقف سے کبھی سابقہ پیش آیا ـــــ حتیٰ کہ مکہ کے نہایت تکلیف دہ اور جاں گسل دور میں بھی نہیں ـــــ ایک ایسا موقف جس پر اس دن

لوگوں کے اندر سخت اضطراب پیدا ہو گیا......!!

یہ لوگ اس سے قبل ہر جنگ میں ان پر غالب ہوتے رہے تھے......اور قریش ان کے شہر مدینہ میں داخل ہونے یا ایک بالشت زمین پر قبضہ جمانے کی ہمت تک نہ کر سکے تھے۔ بلکہ ابھی ان کی وہ رُسوائی کی بدمزگی بھی دُور نہیں ہو پائی تھی جو ان کو غزوہ خندق میں لاحق ہوئی تھی ..... کیا یہ تمام باتیں اس امر کے لئے کافی نہ تھیں کہ اس صلح میں مسلمانوں کا ہاتھ اوپر ہوتا اور ترجیحی حیثیت ان کی ہوتی ؟؟

پھر آخر کس بات نے اس قدر جھکنے پر آمادہ کر دیا.....؟!

اے اصحابِ رسولؐ! (اللہ آپ سے راضی ہو) یہ تو سراسر اللہ کی حکمت کا معاملہ تھا.....

اور یہی اس عظیم الشان دن کی حقیقی عظمت ہے.....!!



قریشی نمائندے نے صلح نامہ کی ابتدا بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کرنے سے انکار کیا کیوں کہ یہ دو کلمے الرَّحْمٰن اور الرَّحِیْم دراصل وصفی کلمے تھے[1] جن کو مسلمان اللہ رب العالمین کا نام سمجھتے تھے..... پھر اس نے انکار کیا کہ "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمدؐ رسول اللہ نے صلح کی۔" اور مطالبہ کیا کہ اس جملے سے وصفِ رسالت کو حذف کر دیا جائے..... اور دونوں باتوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً راضی ہو گئے۔

پھر اس معاہدہ سے یہ لازم آیا کہ مسلمان اس سال مکہ میں داخل ہو کر زیارتِ بیت اللہ کئے بغیر واپس چلے جائیں۔

پھر اس پر یہ پابندی بھی لگی کہ اگلے سال جب آئیں تو تین دن سے ایک گھنٹہ بھی زیادہ قیام نہ کریں۔

---

[1] ان دونوں کلموں میں الرحمان کا استعمال عربوں کے لئے بالکل نیا تھا۔ جس پر ان کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ کیسا کلمہ ہے جو اللہ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ گویا ایک نیا کلمہ وضع کیا گیا تھا۔ (مترجم)

پھر مسلمانوں پر لازم آ گیا کہ اگر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مکہ کا کوئی شخص مدینہ جا کر اسلام قبول کر لے تو اس شخص کو مکہ واپس کر دیں گے۔

ان تمام شرطوں کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا اور معاہدہ مکمل فرما دیا.....

لیکن مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے اوسان خطا ہو رہے تھے اور اس موقف سے ان کی عزتِ نفس اور رگ وپے میں جوش وجذبات ابال کھا رہے تھے۔ اور وہ محض اس وجہ سے کہ یہ رسول اللہؐ کا اقرار تھا، اس احترام میں اپنے قربانی کے جانوروں کی اس رسوائی کو حیرانی و پریشانی کے ساتھ گوارا کر رہے تھے۔ اور اپنے مشاعرِ زیارت کو قریش کے غرور پر رسوائی کا عذاب پھوٹ پڑنے کے لئے چھوڑ جانے پر آمادہ ہو گئے تھے.....!!

ان کی نظریں حیران ہو کر سوالیہ نشان بنی رہیں..... آخر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خاموش نہ رہا گیا۔ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر ہی دیا کہ :۔

کیا آپ اللہ کے رسولِ برحق نہیں ہیں.....؟

حضورؐ نے جواب دیا : ہاں !.....

عمرؓ : کیا ہم مسلمان نہیں ہیں.....؟

حضورؐ : ہاں.....!

عمرؓ : کیا وہ لوگ مشرک نہیں ہیں.....؟

حضورؐ : ہاں.....!

عمرؓ : پھر ہم کیوں اپنے دین میں ذلت کو قبول کریں؟

حضورؐ : میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

اور وہ بھی ہمیں ہرگز ضائع نہیں ہونے دے گا۔"

مسلمانوں نے اس گہرائی کی بات کو سنا..... اور ان کو معلوم ہو گیا کہ اگرچہ رسول اللہؐ نے ان کے مکّہ میں داخل ہونے اور زیارتِ بیت اللہ کرنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ اِسی سال.....

ان تمام باتوں کے باوجود یہ موقع مسلمانوں کے لیے سخت گرانبار تھا کیوں کہ وہ بڑے باعزّت تھے اور خود اسلام نے ان کی عزّت و طاقت کو دوبالا کیا تھا۔

ان حالات کی نزاکت اس وقت اور بڑھ گئی جب رسول اللہؐ کے پاس ایک نوجوان عداوت کی نیّت سے آیا لیکن اس کا دل بدل گیا اور اس نے اسلام کا کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سپرد کر دیا.....!!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ابھی معاہدہ کے صلحنامے پر دستخط کر کے فارغ ہوئے تھے۔

.....اور یہ نوجوان حضرت ابوجندلؓ تھے، اسی سہیل بن عمرو کے بیٹے جس نے رسول اللہ کے ساتھ قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے معاہدہ مکمل کیا تھا.....

ان کے باپ نے ان کا گریباں پکڑا اور ان کے چہرے پر نہایت وحشیانہ طور پر مارنے لگا... اور جب اس نے دیکھا کہ اس کی محبت رسول اللہؐ کی آنکھوں میں جھلک رہی ہے تو کہنے لگا:—

"اے محمدؐ..... معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ اس کے تمہارے پاس آنے سے قبل ہی مکمل ہو چکا ہے....."

افسوس بھرے جذبات کے ساتھ رسول پاکؐ نے فرمایا:- تو نے درست کہا....."

ابھی چند لمحات قبل جس معاہدہ کی تکمیل ہوئی تھی اس کی شرطوں کے مطابق مسلمانوں کے اوپر لازم تھا کہ وہ ابوجندلؓ کو قریش کی طرف واپس کر دیں.....

یہی وجہ ہے کہ ان کے باپ نے بڑھ کر ان کو سامنے سے پکڑ لیا اور قریش کے پاس لے گیا، اور اسلام کو گلے لگانے کے نتیجے میں ان کے جسم کو ایذاؤں کا تختۂ مشق بنایا۔

سامنے سے کھینچا، لے گئے اور مارتے رہے۔ اس دوران میں حضرت ابوجندل مسلمانوں سے مدد کرنے کی گذارش کرتے ہوئے کہتے رہے کہ: "اے گروہِ مسلمین! کیا تم لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے کہ مشرکوں کے درمیان واپس لے جایا جاؤں، پھر وہ مجھ پر اذیتوں کے پہاڑ توڑتے رہیں اور میرے دین کو میرے لئے آزمائش بناتے رہیں.....؟

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

"اے ابوجندل! صبر کا دامن تھامے رہو، اور دلجمعی رکھو، اللہ تمہارے اور تم جیسے دوسرے کمزوروں اور مظلوموں کے لئے فراخی اور رہائی کی راہ ضرور پیدا فرمائے گا.....!!"

اس سنگین منظر سے مسلمانوں کے ذہن پر انتہائی شدید نفسیاتی تناؤ کا اثر تھا۔ اپنے بھائی کو شرک وطغیان کے پاؤں تلے روندتے وہ اپنی نظروں سے دیکھتے رہیں، کوئی مدد نہ کر سکیں، ان کے نزدیک اس بے بسی کی زندگی سے موت بہتر تھی۔

لیکن اللہ تو اپنے معاملہ کو پورا کر کے رہنے والا تھا.....

اس نے اس مثالی دن میں، یہ چاہا کہ ان مسلمانوں کے لئے اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے بھی، اپنی حکمت و تدبیر کی ایک جھلک دکھلا دے تاکہ اس دن کی بات لوگ یہ سمجھ سکیں کہ وہ لوگ کس طرح ایمان لائے تھے کہ اپنے آپ کو اس کے اوپر سونپ دیا تھا اور اس پر اعتماد کیا تھا......

ذاتِ باری تعالےٰ نے پسند فرمایا ــــ کہ مومنوں کے اندر تردّد اور سوالات اٹھنے کا جو کچھ شائبہ بچا کھچا تھا، اس سے بھی ان کے ایمان کو پاک وصاف کر دے.....

اور اس ذاتِ پاک نے پسند فرمایا ـــــــــ کہ جن لوگوں نے اسلام کا دفاع کرنے کی غرض سے تلواریں سونت لیں، ان کو سبق دے کہ تلواروں کا کام بس اسی قدر ہے جتنا مقصد کی پاکیزہ طور پر برآری کے لئے ناگزیر ہو۔ کیوں کہ اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے سلامتی کا دین ہے ..... باہم جدائی یا مصالحت یا امن پسندی کا جو بھی موقع مل جائے، وہ اس کے نزدیک غنیمت ہے ..... چنانچہ، حدیبیہ کی صلح کو ابھی دو سال بھی نہ گذرے تھے، کہ مسلمان مکہ میں ہزاروں کی تعداد میں رسولِ کریمؐ کی قابلِ اعتماد شخصیت کی ماتحتی میں داخل ہوئے، بلکہ سارا مکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی عداوت کو دفن کر کے اللہ کے دین میں داخل ہو گیا ـــــــــ!!



یہ بات تو بہرحال واضح طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ اس دن کے تمام تر واقعات دراصل ذاتِ والائے حکمت و قدرت کی تدبیر کے تحت رونما ہوئے تھے۔

یہ بات اور زیادہ عیاں ہو گئی اس وقت جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان مدینہ واپس ہو رہے تھے تو راستہ ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ فتح کی وحی نازل ہوئی جس میں ان واقعات کی تفسیر ملتی ہے اور اللہ کی حکمتوں کے بعض پہلوؤں سے پردہ کشائی کی گئی ہے۔

وحی نے برملا یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لئے اپنے برخلاف صورتِ حال سے واسطہ پڑنے کے علی الرغم، درحقیقت صلح حدیبیہ نے مستقبل میں فتح اور مالِ غنیمت سے سرفرازی کے دروازے بڑی کشادگی کے ساتھ کھول کر رکھ دیے۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا .... اے نبی ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری
نَصْرًا عَزِيزًا ....! اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگذر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت

کی تکمیل کر دے اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو

زبردست نصرت بخشے۔

وحی نے یہ بھی اعلان کیا کہ اس تپش وحدت والے دن نے، مسلمانوں کے خیال میں، ان کی قوائے نفس کو تپا دینے والی چمک و دمک عطا کی اور اس تپش سے انھوں نے مومنانہ سکونِ قلب حاصل کیا۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ — وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمادی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک اور ایمان بڑھالیں۔

اسی طرح وحی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ سکون جو اُن کو میسر آیا ہے اور جس کے ذریعے ان کے ایمان کو بلند درجے کا یقین نصیب ہوا ہے، یہی حقیقی فتح ہے ..... یہ ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ تھا کہ کوئی فوجی یا سیاسی فتح اس سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا

وَکَانَ ذٰلِکَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ — اور اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔

اور "بیعتِ رضوان" کے ذِکر کو وحی نے دوام عطا کر دیا۔ اور اس کو عظیم الشان اسلامی شاہراہ کے نشانات میں سے ایک واضح نشان کی حیثیت دی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ، یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ...... — اے نبی، جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔

وحی کے ذریعے اس صلح اور اس موقع کے واقعات میں پوشیدہ اللہ کی حکمت کا گوشہ کھل کر سامنے آگیا۔ اور واضح کر دیا گیا کہ اگرچہ اس معاملہ کو مسلمانوں نے توہین آمیز تصور کر لیا تھا لیکن

درحقیقت ایک ایسی عزت افزا صورتِ حال اس کی تہوں سے نمودار ہوئی کہ بے پناہ مالِ غنیمت بھی حاصل ہوئے، اور اسلام کی برکتوں کا بھی اظہار ہو گیا کہ کچھ ہی عرصہ بعد کسی جنگ و جدال کے بغیر اسکی روشنی پھیل گئی اور اس کی ایک ہوا چل پڑی۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً ...... وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔	اللہ تم سے بکثرت اموالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے۔ جنہیں تم حاصل کرو گے۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تم کو عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے۔ اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔

پھر وحی نے صاف صاف یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ خواب جو رسولِ خدا نے دیکھا تھا اور جس کے نتیجے میں آپؐ اور صحابہ کرامؓ مکہ اور مسجد حرام کی زیارت کے مقصد سے نکل پڑے تھے، وہ ایک سچا خواب تھا چنانچہ وحی نے اس کی صداقت کی توثیق کی اور اس وعدہ کے عنقریب پورا ہونے کو ہی قرار دیا:۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ .... فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۔	فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف

نہیں ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لئے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔

○ ○ ○

ابن ہشام نے امام زہری کا ایک قول صلح حدیبیہ کے متعلق نقل کیا ہے کہ :۔

اسلام میں اس سے بڑی کوئی فتح اس سے قبل حاصل نہیں ہوئی تھی، جب صلح کے ذریعے سکون میسر آگیا اور جنگوں کا سلسلہ رک گیا، تو ایسی فضا بنی کہ جس کسی کے کانوں میں اسلام کی آواز پہنچی، وہ فوراً اس کی آغوش میں آگیا۔ یہاں تک کہ ان دو سالوں میں اتنی یا اس سے زیادہ تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوئے جتنی ظہورِ اسلام سے لے کر اب تک اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد تھی۔"

ہاں ..... اللہ تو وہ سب کچھ جان ہی رہا تھا جو لوگوں کے علم میں نہیں تھا، چنانچہ اللہ نے اس کو قریبی فتح کا ذریعہ بنا دیا ..... حدیبیہ کا یہ دن، ۶ھ کے اواخر میں پیش آیا ..... اور ۸ھ کے اواخر میں یعنی صرف دو سال بعد مسلمان دس ہزار کی تعداد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مکہ کا راستہ فاتحانہ شان کے ساتھ طے کر رہے تھے .....

قدرت کی عظیم طاقت نے اس موقع کو استعمال کرنے کے لئے خوب خوب تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے لشکر اسلام کے میمنہ ( ) پر مردِ میدان خالدؓ بن ولید کو لاکر ڈال دیا تھا جو صلحِ حدیبیہ کے فوراً بعد اور فتحِ مکہ سے قبل ایمان لے آئے اور اطاعت اختیار کر کے خدا اور اسلام کی فوج میں جگہ لے کر مدینہ کے رخ پر چل پڑے تھے۔

اس طرح یومِ حدیبیہ کا ایک خاص رنگ تھا، جس نے زبردست حکمتوں اور جلال و اعجاز سے آراستہ قدرتِ کاملہ کے مظاہر کو اپنے جلو میں سمیٹ رکھا تھا .....!!

صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْكَرِيْم

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ

وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

یومِ فتح

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

اعلان کردو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا

(سورۂ بنی اسرائیل : ۸۱)

○ ہم اِس بات سے تو واقف ہی ہیں کہ صلحِ حدیبیہ میں جو فقرے لکھے گئے تھے، ان میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ میں آنا چاہیں وہ آسکتے ہیں اور جو لوگ قریش کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہونا چاہیں، انکو بھی اس کا اختیار ہوگا۔

معاہدہ میں شامل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ شامل ہونے لوگ فریقِ ثانی کے حلیف ہوں گے۔ وہ اس کی مدد کریں گے اور اس سے مدد کے طالب ہوں گے۔

جس دن معاہدہ صلح پر دستخط کا کام مکمل ہوا بس اسی دن قبیلۂ "بنو بکر" کے لوگ قریش کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہو گئے چنانچہ اب اس قبیلہ کے لوگ قریش کے حلیف تھے۔ دوسری جانب قبیلۂ "خزاعہ" کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کرکے ان کے حلیف بن گئے۔

جب معاہدہ پر طرفین کے دستخط ثبت ہو چکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینۂ طیبہ واپس تشریف لے آئے تو آپؐ نے دعوتِ اِلی اللہ کے دائرہ کو وسیع کرنے پر توجہ فرمائی۔ چنانچہ آپؐ نے خطوط لیکر زمین کے مختلف خطوں میں قاصد بھیجے اور مختلف حکومتوں کے سربراہوں، بادشاہوں اور متکبّروں کو خدائے واحد و یکتا پر ایمان لانے کی دعوت دی۔

شاہِ ایران کے پاس.... قیصر کے پاس.... حبشہ کے نجاشی کے پاس.... مصر کے مقوقس کے پاس.... اور خود جزیرہ عرب کے تمام رؤسا کے پاس،.... الغرض اس وسیع و عریض پوری دنیا کے پاس آپؐ کے قدسی سفیروں نے پہونچ کر وہ دعوت پیش کی

جو سراپا حق اور خیر کی دعوت تھی، جو ہدایت اور نور سے معمور دعوت تھی۔

اس پوری مدت میں اللہ کے رسولؐ نے حدیبیہ کے معاہدے کی حرف بہ حرف نگہداشت فرمائی۔ اور بھلا یہ ممکن بھی کب تھا کہ آپؐ کسی معاہدے یا قابلِ اہتمام معاملے میں خلل واقع ہونے کا موقع دیتے!

لیکن، اس کے برخلاف، قریش کا معاملہ یہ رہا کہ جب امن و سلامتی کے اس دور میں اسلام کو اسلحہ و طاقت کے بغیر تیزی کے ساتھ پھیل جانے اور روحانی طور پر نفوذ کرتے چلے جانے کے قیمتی مواقع میسّر آ گئے تو اس سے اہلِ قریش پر ایک طرح کی دہشت طاری ہونے لگی۔ چنانچہ گھبراہٹ میں وہ صلح نامہ میں لکھے گئے اس معاہدہ کو توڑ ڈالنے کے لئے موقع کی تاک میں لگ گئے۔

ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قریش کے حلیف "بنو بکر" نے "بنو خزاعہ" پر چڑھائی کر دی جو رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کے حلیف تھے..... حرمِ مکہ کی حرمت و تقدس کو بہترین جائے پناہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ "خزاعہ" نے "بنو بکر کے مقابلے میں بیت اللہ شریف میں جا کر پناہ لے لی۔ لیکن بنو بکر نے حرمتِ حرم تک کو پامال کر ڈالا۔ اس کے اندر ہی اچانک وہ "خزاعہ" پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ خوفناک طور پر قتل و خون کا بازار گرم کر کے حرمِ پاک کو قربان گاہ میں تبدیل کر ڈالا۔ اور اہلِ قریش اس جرم میں برابر کے شریک بنے رہے۔

جو لوگ بچ نکلے، ان میں "عمرو بن سالم الخزاعی" بھی تھا۔ وہ مدینۃ الرسول کی طرف تیزی کے ساتھ بھاگتا چلا گیا۔ پہونچتے ہی سب سے پہلے مسجد نبویؐ میں داخل ہوا، جہاں آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ سلام اور مصافحہ کے بعد

قبیلہ "خزاعہ" پر جو کچھ بیتا تھا اس کی روداد جوش سے لبریز قصیدے کی شکل میں یوں شروع کیا:

یارب إنی ناشد محمدا ۔۔۔ حلف أبینا وأبیه الأتلدا

فانصر هداك الله نصرا أعتدا ۔۔۔ وادع عباد الله یأتوا مددا

إن قریشا أخلفوك الموعدا ۔۔۔ ونقضوا میثاقك المؤكدا

هم بیتونا بالوتیر هجدا ۔۔۔ وقتلونا ركعا وسجدا

• اے میرے رب! میں محمدؐ کا گن گاتا ہوں، جو ہمارے باپ کا حلیف ہے اور خود اپنے باپ کا جو خاندانی عزت و مال والا ہے • اللہ آپ کو راہ راست پر قائم رکھے، آپ ہماری بھرپور مدد فرمائیے اور اللہ کے بندوں کو پکاریئے کہ وہ مدد کو دوڑیں۔ • اہل قریش نے آپ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اور آپ نے جس پختہ عہد پر تاکید رکھا، اس کو توڑ ڈالا ہے • انھوں نے ظلم کیا، سوئی رات میں ہم پر شبخوں مارا، اور ہمیں رکوع و سجود کی حالت میں قتل کیا۔

اتنے میں ٹھیک "عمرو بن سالم" کی پیٹھ پر خزاعہ کا ایک اور وفد آپہونچا جس نے تفصیل کے ساتھ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے بدعہدی کی روداد سنائی اور اہل قریش کے رویہ کا حال بیان کیا۔

ایسی خبر ملنے کے بعد اللہ کے رسولؐ کی ایک ذمہ داری تھی۔ آپؐ کی ذمہ داری یہ تھی کہ اپنے حلیفوں کی مدد کو اٹھیں، جن کو درندہ صفت اور دغاباز ہجوم کا سامنا تھا، چنانچہ

پہلے آپؐ نے اہلِ قریش کے پاس خبر بھیجی کہ تین صورتیں ہیں، ان میں سے کسی ایک کو تم لوگ منتخب کرلو۔

- خزاعہ کے مقتولوں کا خوں بہا ادا کردو۔
- بنو بکر سے ناطہ توڑلو، اور معاہدہ باطل کردو
- حدیبیہ کے معاہدہ کو منسوخ کردو۔

اہلِ قریش نے تیسری صورت کو منظور کرلیا اور معاہدہ کو منسوخ کرلینا پسند کیا۔

اس انتخاب کا مطلب ظاہر و باہر تھا۔ معاہدہ کے علی الرغم انھوں نے رسولؐ اللہ کے حلیفوں کے مقابلے میں اپنے حلیفوں کی مدد کی، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مقتولوں کے خوں بہا کی جو نہایت منصفانہ صورت پیش فرمائی اس کو بھی رد کردیا۔ اور اب اس پورے معاہدے ہی کو منسوخ کر ڈالا۔ یہ گویا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت شروع کرنے کی تمہید تھی۔

اس کے پیشِ نظر اللہ کے رسولؐ نے ٹھان لیا کہ اب مکّہ کو فتح کر کے ہی دم لیں گے

••• ••• •••

آج یومِ فتح ہے۔ یہ حیاتِ نبوی کے باعظمت دنوں میں ایک عظیم دن ہے۔ اس دن (عبداللہ کے بیٹے) کی خوبیاں اُبھر کر سامنے آگئیں اور آپؐ کی منفرد شخصیت چمک اٹھی۔

- یومِ فتح کی امتیازی خصوصیت دراصل یہ تھی کہ فتح و نصرت کے اخلاقیات میں اس نے ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا، تاریخ انسانی کی ابتداء سے لیکر آج تک ایک نادر و بے مثال نمونہ!

• آپؐ نے تو یہ زوردار اعلان ہی کر رکھا تھا کہ دنیا میں ظلمت وسرکشی اور کھوٹ کا دور بس امروز و فردا کا مہمان ہے، آخر کار اہلِ قریش نے مسلمانوں کو پیٹ کر ایذا پہنچائی اتنی کہ خود بدہضمی کا شکار ہو گئے۔ ان کو خود اپنی تعداد ، پھر اپنے حلیفوں کی کثرت ، اپنی مستحکم سیادت ، اور عوام النّاس کی اندھی پیروی میں مضبوطی پر ناز تھا اور یہی کچھ ان کا توشہ تھا جس کے سہارے وہ جی رہے تھے۔ ان ہی چیزوں کے بل پر اب تک وہ یہ مظاہرہ کر رہے تھے کہ اس پھیلتے ہوئے نئے دین کا گلا گھونٹ دینے کا پورا دم خم ان کے پاس موجود ہے۔ یہاں تک کہ یومِ فتح آگیا جس نے ان کے میزانِ حساب کو یکلخت بدل کر رکھ دیا۔ اور ان کے جھوٹے غرور، ان کی کھوکھلی ڈینگ ، ان کی قوت و گرفت اور ان کے معبودانِ باطل کو اس یومِ حساب کی خوراک بنا کر پیش کر دیا ....!



لیکن یہ یومِ حساب ، اللہ کے رسول ـــــ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ نے اس دن کو فتح و نصرت کے اخلاقیات کی ایک شاندار علامت میں تبدیل کر دیا .... ظرف میں بلندی ، مزاج میں نرمی و رحمدلی اور برتاؤ میں مہربانی و خوش خلقی کی شاندار علامت .... تمام انسانوں اور خود حیاتِ انسانی کے لئے۔

وہ دیکھو، آپؐ کے خیمہ میں آج وہ شخص داخل ہو رہا ہے جو اسلام کے بالمقابل قریش کی ہر جنگ میں قیادت کرتا رہا ہے .... وہ داخل تو ہو رہا ہے مگر اس پر کپکپی طاری ہے کیوں کہ اس کی نظروں کے سامنے (عمرؓ بن خطاب) کی تلوار اس کے سر کو اچک لینے کے لئے لٹک رہی ہے۔

ہاں ! دیکھ لو، .... وہ شخص ابو سفیان ہے۔ فتح و نصرت کے شورت اسکے

کان جھنجھنا اٹھے ہیں اور اسلامی جھنڈوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بوجھل ہو چکی ہیں ... آج وہ یک و تنہا اور کٹا کٹا سا ہے۔ آج اس کے ہمراہ کوئی بھاری فوج نہیں آئی ہے، جو اسکی مدد کے لئے کھڑی ہو۔ وہ فوج جس کو لیکر اب تک وہ اسلام اور اس کے رسولؐ کے خلاف خلاف برسر پیکار رہا ہے۔

ہاں! یہ وہی شخص ہے .... آج اس کے سامنے اس کے سوا کوئی تمنا نہیں ہے کہ رسولؐ اس کی جاں بخشی کر کے اس کی زندگی کی حفاظت فرمادیں .... اس کو یہ امید اس لئے بندھی ہے کہ آج اللہ کے رسول کی انسانی قدریں جلوہ فشاں ہیں اور بے مثال تابندگی پیدا کر رہی ہیں۔

آج آپؐ کو اسی ذلت و رسوائی نے عزت بخشی ہے جس سے ابوسفیان نے آپؐ کے خلاف مہم شروع کی تھی .... اور یہ وہی شخص ہے جو ایک مدت سے پورے قریش کا سردار بنا رہا تھا ... اور وہ شخص قریش کے شیوخ اور سرداروں کی برپا کی ہوئی سختیوں سے باز آچکا ہے۔

کل تک اس کے اندر شرارت اور ایذا رسانی کی خو، بو تھی تو وہ اپنے قبیلہ کا حامی و نگہبان بن کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ عداوت پر کمربستہ تھا .... لیکن آج، اس عظیم فتح و نصرت کے مشاہدات نے اس کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی شرارت اور ایذا رسانی کے رویہ کو بدل دے۔ تو آخر اللہ کے رحم و کرم اور احسان کے اس خاص دن میں اتنا وافر اعزاز و اکرام اس کے حصے میں کیوں نہ آتا ؟؟

اللہ کے رسولؐ نے اپنے ایک صحابی کو حکم فرمایا کہ وہ گھوم گھوم کر آواز لگائیں :

* "جو شخص مسجدِ حرام میں داخل ہوگیا اس کو امان"
* "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا اس کو امان"
* "جو شخص خود اپنے گھر کے اندر بند ہوگیا، اس کو امان"

ذرا غور تو کرو! مسجدِ حرام، اور ابوسفیان کا گھر..... کیسی عزت و تکریم ہے یہ!!
کیا یہ کسی قائدِ قریش کی ذات کے ساتھ گھومنے والی تکریم ہو سکتی ہے؟ اور کیا وہ ایسی عزت افزائی کا تصور خواب و خیال میں کر سکتا تھا۔؟!

اس کو یہ مقام محض نرم مزاجی نے عطا کیا تھا..... اگر وہ خود اپنے کان سے رسولِ پاک علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے صرف ایک کلمۂ عفو و درگذر سن لیتا تو وہ اپنے آپ کو کامیاب ترین انسان تصور کرتا..... جبکہ آج اسی کے نام کے ساتھ عفو و درگذر کا عَلَم بلند کیا جا رہا ہے۔ منادیٔ رسولؐ آواز لگا رہا ہے کہ ابوسفیان کا گھر دارالامان اور جائے پناہ ہے..... آج اسی کو حرمت و تکریم اور پاسداری کا شرف حاصل ہے۔

واہ! کیسی تیری بلندیٔ ذات اور کیسا تیرا جلالِ اوصاف! تجھ پر سب کچھ قربان، اے اللہ کے رسولؐ!

یہ گھر۔ اسی شخص کا گھر تو ہے جس نے مسلسل دس سال تک مسلمانوں کو رسوائی کے بوجھ تلے دبائے رکھا۔ اور اسی گھر میں سر چھپائے رہی (ھندہ)۔ ابوسفیان کی بیوی۔ جس نے جنگ احد میں آپؐ کے چچا (حمزہ رضی اللہ عنہ) کا شکم چیر ڈالا تھا..... اور بہتے ہوئے خون میں نکلے کلیجے کو چبایا تھا۔ اور ان کی آنتوں کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا تھا.....

کہاں ہے انسانی تاریخ میں ــــــ پوری انسانی تاریخ میں ــــ ایسی نرمی کی کوئی مثال ؟ .... ایسی بلندی اور ایسے جلال کی بھی کوئی مثال ....؟؟

سچ فرمایا ہمارے ربِ بزرگ و بالا نے:

" بلا شبہہ تم ایک عظیم اخلاق کے حامل ہو۔"

اس نرمی کے پیچھے ہی اس عظیم الشان فتح کے دن ہمیں آپؐ کی نمایاں بلندی بھی نظر آتی ہے۔

اُس دِن اسلامی لشکر کے ایک کمانڈر (سعد بن عبادہ انصاریؓ) بھی تھے۔ ان پر یہ ذمہ داری تھی کہ جبلِ کُدار کے پاس معلاۃ کا جو علاقہ ہے اس کے اس گوشے سے وہ داخل ہوں جہاں سے فیلقہ شروع ہوتا ہے اور وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے داخل ہونے کے لئے آگے آگے راستہ بناتے چلیں۔ ....

اچانک ان ہی لمحات میں سعدؓ بن عبادہ کو وہ مصیبتیں یاد آگئیں جو بیعتِ عقبی کے موقع پر اہلِ قریش نے ان پر ڈھائی تھیں، ــــ کہ جب اس دن "بیعت" کی خبر زعماءِ قریش کے کانوں تک پہونچی تھی تو وہ نکل پڑے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر جن انصار نے بیعت کی تھی ان کو اٹھا کر پھینک دیں۔ لیکن ان کے پلے صرف دو اشخاص ہی پڑے۔ ان میں سے بھی ایک شخص بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ باقی رہا ایک، تو اس کو لوگوں نے پکڑا اور مکہ لے گئے تاکہ اس کو عذاب کی چکی میں ڈال کر لوگ اپنی بھڑاس نکالیں۔ وہ یہی شخص تھا ــــ سعد بن عبادہؓ۔

اس دن لوگوں نے ان پر بے پناہ ظلم ڈھایا تھا لیکن جوں ہی ان کو معلوم ہوا تھا

کہ یہ شخص مدینہ کے زعماء میں شمار ہوتا ہے جہاں ہو کر ان کا شام کا تجارتی راستہ گذرتا ہے تو انھوں نے ان کو فوراً چھوڑ دیا تھا۔

(سعد) کو اپنا وہ افسوسناک ماضی یاد آ گیا۔ اللہ نے اس باعظمت دن میں اپنے صاحبِ ایمان بندوں کو فتح سے نوازا تھا۔ سعد جب مکہ کے دروازوں سے قریب ہو رہے تھے تو اس نشہ نے زور مارا، اور وہ پکار اٹھے:

"آج گھمسان کی جنگ کا دن ہے.... آج مجرموں کا خون مباح ہے۔"

ان کے یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دہرائے گئے۔ ان الفاظ کو سننا تھا کہ آپ چراغ پا ہو گئے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ تم آگے بڑھو اور سعد بن عبادہ سے فیلقہ کا کمان لیکر خود سنبھال لو اور پرچمِ اسلامی کو خود اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے مکہ میں داخل ہو....!!

آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی فتح و نصرت کے ایسے عظیم الشان دن میں گوارا نہ تھا کہ آپ کے صحابہ یا اس لشکرِ اسلامی کے کمانڈروں کے دماغ میں فخر و غرور جگہ پائے۔

کیوں؟ —— اس لئے کہ آپ کوئی غازی و فاتح نہ تھے کہ آپ کے نزدیک غازیوں اور فاتحوں کا وطیرہ جگہ پاتا۔ آپ تو ایک رسول تھے، ایک ہادی و راہبر تھے... فتح و نصرت کے شور اور بھیڑ بھاڑ کو دیکھ کر نہ رسولوں کے دلوں میں فخر و غرور جاگزیں ہو سکتا ہے، نہ ہی یہ اللہ کے مومن بندوں کے دلوں میں جگہ پا سکتا ہے.... بلکہ ان کی تو پیشانیاں شکر و سپاس کے جذبات سے لبریز اللہ کے آگے جھک جاتی ہیں، زمین سے جا لگتی ہیں۔!!!

••• ••• •••

رسُول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو نکلے تھے تو مکّہ جانے کے ارادہ کو بالکل راز میں رکھا تھا۔ اور ربِّ قدیر کے آگے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر فرمایا تھا:

"اے اللہ مجاہدین کو اہل قریش کی نظروں سے اور ہماری مہم کے متعلق خبروں کو ان کے کانوں سے بچائے رکھیو، جب تک ہم ان کے شہر میں داخل نہ ہو جائیں۔"

آپؐ کی آرزو تھی تو بس اس بات کی کہ یہ اچانک جا پہونچنے کی مہم کامیابی سے ہمکنار ہو تاکہ آپؐ کی رحم دلی اور کشادہ ظرفی کو اظہار کا موقع ملے.... ورنہ آپؐ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر کارروائی سے قبل فتح کی مہم سے اہلِ قریش باخبر ہو گئے تو وہ بیدار ہو جائیں گے اور تیزی دکھا کر آمادۂ پیکار جُٹ جائیں گے۔ اس طرح مسلح تصادم کی شکل پیدا ہو جائے گی اور جنگ و خوں ریزی کی نوبت آجائے گی۔ ـــــ جبکہ اللہ کے رسُول کی تمنا یہ تھی کہ فتحِ اسلامی کے اس موقع پر خون نہ بہے۔

مگر اللہ تو اس مہم کے لئے اپنی جانب سے فتح و کامرانی کے راستے کھول چکا تھا۔ چنانچہ مکّہ نے وہ دن دیکھا جب دس ہزار مسلمان جھنڈے اور تلواریں اٹھائے اس کے جلو میں موجود تھے۔ اس کی جانب سے نہ تو بھڑکانے والی کوئی جوابی کارروائی تھی، اور نہ ہی یہ مہم اس کے دل کو بھا رہی تھی۔

اللہ کے رسولؐ نے اسلامی لشکر اور اس کے کمانڈروں کو حکم دے رکھا تھا کہ خبردار! ایک قطرہ خون نہ بہے، بلکہ امن و عافیت اور سلامتی کا مشن لئے اس حرمت و تقدس کے شہر میں داخل ہونا ہے.....

مسلمانوں نے اپنے رسولِ مقتدا کے حکم کی پوری شدت سے تعمیل کی۔ اور ایک دو حادثوں کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ان حادثوں میں قریش کے پانچ آدمی قتل اور دو مسلمان مقامِ شہادت پر سرفراز ہوئے۔ اس کھلی کامرانی کی آب وتاب میں معجزہ جھلکتا نظر آرہا تھا۔ ضیاء پاشی کے ایک نئے انداز میں اس کامرانی کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے .... یہ وہی ذاتِ رسالتؐ ہے جس کے سر پہ فتح ونصرت کا سہرا بندھا ہے۔ آج وہ سراپا معجزہ بنا اس مقام پر کھڑا ہے کہ اس کو اپنے دین اور اپنی تعلیمات کو دوسروں پر تھوپنے کا پورا پورا موقع میسر ہے لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ توبس ایک ہی بات کو نشانہ بنائے آگے بڑھ رہا ہے ــــــ یعنی وہ شرک وبت پرستی کے مظاہر کو ہٹا کر ہی دم لے گا۔ اور ان مظاہر کے پیچھے کارفرما ضلالت اور نظامِ باطل کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکے بغیر چین سے نہ بیٹھے گا.... یہی وجہ ہے کہ مکہ میں وہ ایک لمحہ بھی خموش اور مطمئن نہ رہا۔ جب تک اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا دیا۔

جب اس پہلو سے آپؐ کو اطمینان ہوگیا کہ اہلِ مکہ امن وسکون کو بحال رکھے ہوئے ہیں تو آپؐ نے بیت اللہ شریف کا رُخ کیا۔ طواف کے سات پھیروں سے فارغ ہوئے۔ مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ بازوؤں اور صحن میں تمام مورتیاں بھری پڑی تھیں .... اور سیسہ اور لکڑی کی شبیہیں ہر طرف موجود تھیں۔ بڑی مدت تک انسانی شرافت ان کے سامنے رسوا اور عقل وضمیر کا احترام پامال ہوتا رہا تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا جب حرمتِ انسانی کے پاسبان ــــــ صلی اللہ علیہ وسلم ــــــ اس مقام پر تشریف فرما ہو کر ان مورتیوں اور شبیہوں کو زمین پر مار مار کر چکنا چور کر رہے تھے اور زبانِ مبارک پر اس آیت کریمہ کی تلاوت جاری تھی:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ اور
اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ہ یقیناً باطل مٹنے ہی والا تھا۔

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۱)

آپؐ کی نظر بیت اللہ کی دیواروں کی طرف گئی۔ دیکھا کہ بہت سی تصویریں نقش ہیں۔ مشرکوں نے اللہ کے فرشتوں کی بھی شبیہیں بنا رکھی تھیں۔ ان شبیہوں کے درمیان ایک بڑی شبیہ ابوالانبیا ر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تھی جو فال نکالنے کے تیر تقسیم کرتے دکھائے گئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر آپؐ آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے!

"ان فال کے تیروں سے بھلا ابراہیم کو کیا سروکار"!

پھر یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی۔:

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا ابراہیم (عَلَيْهِ السَّلَام) نہ یہودی تھے
وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا نہ نصرانی، وہ تو مسلم یکسو تھے،
مُّسْلِمًا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وہ مشرک نہ تھے۔

(سورہ آل عمران آیت ۶۷)

••• ••• •••

اہلِ قریش ڈرے سہمے تھے۔

حالاں کہ سچی بات یہ ہے کہ یہ لشکر مکہ میں پُر امن طور پر داخل ہوا تھا...... لیکن ان کے دلوں میں وسوسہ تھا کہ اب اس کے بعد معاملہ کیسا رہے گا:- !! .... رسولؐ اور ان کے مسلمان ساتھی ان ظالموں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے جنھوں نے ان پر ظلم و ستم

کے پہاڑ توڑے تھے۔ پھر جنگ پر اُتر آئے تھے ...... مسلسل بیس سال کے طویل عرصے تک !!

کیا یہ لوگ ان کے ساتھ جنگی مجرموں کا سا برتاؤ کریں گے ؟ .... اور جن اہلِ حق کا اب تک انھوں نے خون کیا تھا ..... ان کے قصاص کی کون سی شکل تجویز کی جائے گی ؟ !....

منادی آواز دینے لگا :

"آؤ غور سے سن لو، رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) خطاب فرمانے جا رہے ہیں"

ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے۔ مجمع ششش و پنج میں کھڑا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے خوف اور سراسیمگی ان کو بھینچ لیتی تھی، تو دوسرے ہی لمحے امید کی کیفیت سے وہ مسرور ہو اٹھتے تھے ..... اور تاریخ تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ایسے بے مثال منظر کا ریکارڈ ضبط کرنے کی منتظر کھڑی تھی۔

خانہ کعبہ کے دروازہ پر رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور خطاب شروع فرمایا :

"ایک اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے، اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔"

"اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا"

"اس نے اپنے بندے کی مدد کی"

"تنہا اسی کی ذات نے گروہوں اور ٹولیوں کو شکست دی۔"

اس نے اپنے "بندے" کی مدد کی..... آہا! چن کر کیسا شاندار لفظ فرمایا گیا تھا!
آخر کیوں نہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے کہ: اس نے اپنے "رسول یا نبیؐ" کی مدد کی....؟؟
آج آپؐ بذاتِ خود اس مقام پر کھڑے تھے کہ گرد و پیش کی ہر چیز حتیٰ کہ مکے کے سخت پہاڑ بھی فتح کی مستی و سرور میں جھوم رہے تھے۔ اس بکھری ہوئی مستی کے لئے "بندہ" کا لفظ تریاق تھا..... اور ذاتِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اصل جوہر یہی لفظ تھا!!
آپؐ نے اپنی ذات کو کبھی ایک بندے اور غلام سے زیادہ نہیں سمجھا.... آپؐ کے اس وطن میں جہاں آج آپؐ کی فتح و کامرانی اپنے کمال کو پہونچ چکی تھی، جہاں آپؐ کے دشمنوں اور خار کھانے والوں کا اقتدار خاک میں مل چکا تھا، جہاں آپؐ کے جھنڈے بلند تھے اور شوکتِ فتح کی فضائے آسمانی میں ہر طرف لہرا رہے تھے..... اسی وطن میں اس وقت آپؐ کا یہ حال تھا کہ آپؐ کے اندر اللہ کی بندگی کا شعور نہایت گہرائیوں میں اترا ہوا، اور بہت دور تک پہونچا ہوا تھا!
تکبیر و تہلیل کے ان کلمات کے بعد جب آپؐ نے اللہ کی توحید و تمجید کا ذکر پورا کرلیا تو اپنا وہ اصل خطاب شروع فرمایا جس کو اس فتح کے موقع پر سننے کے لئے دل بے تاب تھے!
تمہارا کیا اندازہ ہے؟ یہ فاتحانہ خطاب کتنا طویل ہوگا؟ اور یہ اس یومِ مشہود کا کتنا وقت لے گا؟ پھر آپؐ اپنے چبھنے والے تلخ و تند الفاظ میں کیا کیا فرمائیں گے؟ یہی سوالات ہر دل میں موجزن تھے۔ اتنے میں آپؐ نے فرمایا:
"اے قریش کے لوگو!"

اس ندا کے بعد آپؐ کی خاموشی کا جو لمحہ تھا، اس لمحہ میں قریش کے خاندانی لوگوں کے دلوں میں سیکڑوں خیالات کا ہجوم اٹھنے لگا۔ ہر ایک اپنے دل میں اندازہ لگا رہا تھا کہ اگلا جملہ کیا ہوگا ——— ان کے ہاتھوں جو شرارت و بدسلوکی ہوتی رہی ہے، اس پر یقیناً گرجدار ڈانٹ اور پھٹکار کا جملہ ہوگا۔

لیکن ہر ایک کی توقع کے خلاف اگلا جملہ یہ تھا:

"اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء پرستی کے تکبّر کو دور کر دیا ہے۔"

"تمام انسان آدم سے ہیں، اور آدم مٹی سے بنے تھے۔۔"

پھر آپؐ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور
مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ	ایک عورت سے پیدا کیا اور تمکو خاندانوں
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ	دوسرے کو پہچانو، بیشک تم میں زیادہ
اَتْقٰکُمْ	عزت والا وہ ہے جو تم میں اللہ سے
(سورہ حجرات آیت ۱۳)	زیادہ ڈرنے والا ہے۔

یہ ہیں اللہ کے رسول! شرافت اور خوبیوں کے مالک! ابھی آپؐ کے پاس کینہ بدلہ اور قصاص کے لئے وقت نہیں ہے۔ آپؐ کی تو زندگی کا ہر لمحہ کارِ رسالت کے لئے وقف ہے۔

دیکھ لو، اللہ کی توحید کے بعد آپؐ نے انسان کے مقام کی بلندی کا اعلان فرمایا

حسب ونسب پر باہم فخر کرنے سے منع فرمایا، .... تمام انسان برابر ہیں .... بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے !!

آپؐ نے فرمایا :

• اے گروہِ قریش" ! .....

یہ پکار سن کر ایکبار پھر گردنیں اٹھنے لگیں اور نگاہیں مرکوز ہوگئیں .... لیکن خوشخبری آسمانی بارش کی طرح موٹی موٹی بوندوں میں تیزی کے ساتھ ٹپک گئی :-

" تمہارا کیا گمان ہے ؟ تمہارے ساتھ میرا کیسا سلوک ہوگا ؟

ڈرا سہما ہوا مجمع، بیک زبان بڑبڑانے لگا، جیسے کہ قبل ہی سے سب نے مل کر جواب طے کر رکھا ہو :

• بہترین سلوک :

• ایک شریف بھائی، ایک شریف بھتیجے کا سلوک"

سیّد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نوکِ زبان سے صدائے تہلیل لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے ساتھ یہ الفاظ نکلے۔ اور خطاب پورا ہوا۔ :

["جاؤ، تم لوگوں کو چھوڑ دیا گیا"] ....!!!

یہ تھا خطاب فتحِ عظیم کے دن کا، فاتحانہ خطاب .....

دو تین منٹوں سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ اسی میں اللہ کی بڑائی اور تعریف بھی کی گئی ...... اس نئے انسان کی کرامت و بزرگی کا اعلان بھی کیا گیا جو اسلام کے سائے میں بن کر تیار ہوتا ہے .... اور ان کج فہم مجرموں کو، جو قصاص کی امید کر رہے

تھے جس کے وہ حقدار بھی تھے، عام معافی، شریفانہ انداز کی معافی کا اظہار بھی کر دیا گیا۔

یہ ہے رسولؐ کا سلوک اور اسلام کا مسلک ....

●●● ●●● ●●●

پھر یہ دیکھئے! آخر وہ کون سی وجہ ہوسکتی تھی کہ آپ علیہ السلام نے نام لے لے کر چند مشرکوں کو قتل کرنے کا حکم فرمادیا، اس تاکید کے ساتھ کہ ان کو قتل کر دو خواہ وہ غلاف کعبہ ہی سے کیوں نہ چمٹے ہوں؟

فتح کے دن رسول علیہ السلام کے سلوک کی یہ جو ظاہری صورت پیدا ہوئی یہ جواب کی متقاضی ہے، اگر ان کے قتل کا حکم محض تسکین نفس اور جذبۂ انتقام کے تحت تھا تو اس کے لئے زیادہ موزوں "ابوسفیان" اور عکرمہ بن ابی جہل ہوسکتا تھا۔ اور دسیوں ایسے زعماء قریش ہوسکتے تھے جو ہمیشہ مصروف عناد رہے۔

پھر اگر تسکینِ نفس اور جذبۂ انتقام کا اس دن وجود ہوتا تو اس کے اثرات عام فاتحین کے طریقے پر ان کے رویّے سے بھی ظاہر ہوتے۔ اس لئے یقیناً یہ بات باور کرنے کے لائق نہیں ہے لہٰذا ان کے ساتھ یہ معاملہ لازماً ان کے جرم ہی کی بناء پر ہوسکتا ہے جو اللہ کے رسولؐ کے علم میں رہا ہوگا۔ کیوں کہ عدل وقانون کی رُو سے قصاص ایک ایسی سزا ہے جس میں قتل کے بدلے قتل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی تائید ایک ایسے شخص کے معاملے سے ہوتی ہے جو' ان لوگوں میں تھا جن کا قتل اللہ کے رسولؐ نے مباح کر دیا تھا۔ یعنی ..... عبداللہ بن خطل ... کا معاملہ۔ یہ شخص مسلمان ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اس کو زکوٰۃ جمع کرنے کی مہم پر بھیجا۔ اور اس کی خدمت اور مدد کے لئے انصار میں سے ایک مسلمان

کو اس کے ساتھ کر دیا .... لیکن راستہ میں اس نے غداری کر کے اپنے اس مسلمان بھائی کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ بھاگ کر مکہ چلا گیا۔ اسلام کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی کے آبائی دین میں شامل ہو گیا۔

اس لحاظ سے وہ قاتل تھا۔ قتلِ عمد کے جرم کا مرتکب تھا۔ ساتھ ہی وہ قصاص کے ڈر سے بھاگ کر مرتد ہو گیا تھا، اس نے اپنا دین بدل لیا تھا۔

قدرتی بات ہے کہ دنیا کا کوئی بھی قانون اس کے بھاگ کر غائب ہو جانے کے سبب اس کو سزا سے بری نہیں کر دے گا، اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے قتل کا حکم تو دے دیا تھا مگر اس دن ان میں سے اکثر لوگ قتل نہیں کئے گئے تھے .... !! کیوں کہ ان میں سے بعض تو نادم ہو کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور آپؐ سے معافی حاصل کر لی۔ کچھ دوسرے لوگ وہ تھے جن کے لئے خود آپؐ کے کسی صحابی نے سفارش کی تو آپؐ نے ان کو معافی دے دی۔

اس طرح فتح کا یہ عظیم دن تسکین نفس اور انتقام کا دن نہیں تھا .... بلکہ حسنِ سلوک، رحمدلی اور سلامتی کا دن تھا۔

اس دن ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے تو فُضالہ بن عمیر" آپؐ کی جان لینے کی غرض سے آپؐ کے قریب آ گیا .... اور آپؐ کے ساتھ جو بھیڑ تھی اس کی آڑ میں بچتا رہا۔ جب وہ آپؐ کے سامنے آ گیا اور اس پوزیشن میں تھا کہ لوگوں کی نظر سے بچ کر آپؐ پر وار کر سکے تو اچانک اس نے دیکھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف مائل ہوئے اور دریافت فرمایا :

"ارے ! فضالہ ہو !

وہ شخص دم بخود رہ گیا۔ جواب دیا۔ "ہاں، اے اللہ کے رسولؐ، میں فضالہ ہوں۔!!

آپؐ نے پھر سوال کیا :

"فضالہ، تم دل ہی دل میں کیا سوچ رہے ہو ؟"

فضالہ کی بے چینی بڑھ گئی اور بلبلا کر بولا :

"کچھ نہیں ..... بس اللہ کی یاد کر رہا ہوں ..... !!

آپؐ کو ہنسی آگئی۔ اور فرمایا : "فضالہ تم اللہ سے معافی مانگ لو !"

یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے اپنا دستِ مبارک موڑ کر اس کے سینے پر رکھ دیا ....

اب سنئے ! فضالہ کہتے ہیں کہ :

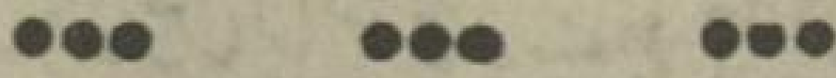
"خدا کی قسم جب آپؐ نے اپنا دستِ مبارک ہٹایا، اس وقت تک میرا دل جھک چکا تھا۔ اور آج اللہ کی مخلوق میں میری محبوب ترین آپؐ کی ذات ہے۔" !!

چنانچہ فضالہ حلقۂ اسلام میں ضم ہو کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے۔

کیا دنیا کی نظروں نے ایسی نرمی کبھی دیکھی ہے ..... ایسا حسنِ سلوک کبھی دیکھا ہے ..... ہاں ! اور کیا اس جیسا کوئی انسان کبھی دیکھنے میں آیا ہے ؟ ؟

نرم مزاجی کی یہ آب و تاب جو فتح کے دن دیکھنے میں آئی وہ مجرد اس صورت میں سامنے نہ تھی کہ آپؐ باتیں منواتے، تعلیم دیتے اور خوشخبریاں سناتے تھے ..... بلکہ ایسے حالات و ظروف کے اندر تطبیق اور عملی تمرین کی حیثیت رکھتے تھے جن میں ترقی و سربلندی کے اور ناکامی و محرومی

کے بھی عوامل کارفرما تھے..... بلکہ ناکامی کے عوامل، یعنی موقف کی ترتیب میں نرمی کی فضیلت کی ناکامی، اس دن بہت زیادہ نمایاں تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے مشرکوں سے بہت سی چوٹیں کھائی تھیں اور ہلاکت سے دوچار ہوئے تھے۔



لیکن نبوت آج خاتم النّبیین اور امام المتقین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت سے منسلک تھی۔ اس لئے کسی کوشش اور کسی توجہ کے بغیر ہی نرم مزاجی نے فائدہ دکھایا۔
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بخششوں اور توفیق کی بدولت، پھر اپنی عظمتِ ذات اور فضائل اوصاف کی طاقت سے اِس یومِ فتح کے ذریعے انسان کے لئے شرف و بڑائی اور حیات کے لئے نور مہیا فرمایا.... !!!

یومِ حُنَین

إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ، فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا.

اس دن تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا
مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی

(سورۃ توبہ : ۲۵)

لوگوں کے اندر سخت اضطراب پیدا ہو گیا......!!

یہ لوگ اب تک ہر جنگ میں ان پر غالب ہوتے رہے تھے...... اور قریش ان سے شہر مدینہ میں داخل رہتے، یا ایک بالشت زمین پر قبضہ جب تک ہمت نہ کر سکے تھے، بلکہ ابھی ان کی وہ رسوا کن بدمزگی بھی دور نہیں ہو پائی تھی جو ان کو غزوۂ خندق میں لاحق ہوئی تھی...... کیا یہ تمام باتیں اس امر کے لئے کافی نہ تھیں کہ اس صلح میں مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو اور قریش کی حیثیت اتنی نہ ہوتی؟؟ پھر آخر کس بات نے اس قدر جھکنے پر آمادہ کر دیا......

اے اصحاب رسولؐ! [illegible] کا منتظر تھا......

اور کیا اس عظیم الشان دن کی کیا حکمت ہے......!!

○ ○ ○

یہ کس بات کا نتیجہ تھا کہ قریش نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے سے انکار کیا، بلکہ باسمک اللّٰھم لکھو [illegible] کا اعلان [illegible] کام سمجھتے تھے...... پھر انہوں نے [illegible] پر محمد رسول اللہ [illegible] اور مطالبہ کیا کہ اس معاہدے سے وصف رسالت کو حذف کر دیا جائے...... اور دونوں باتوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً راضی ہو گئے تھے (ق ج ۔۔)

پھر اس معاہدے سے یہ لازم آیا کہ مسلمان اس سال مکہ میں داخل ہو کر زیارت بیت اللہ کے بغیر واپس چلے جائیں۔

پھر اس میں یہ پابندی بھی لگی کہ اگلے سال جب آئیں تو تین دن سے ایک گھڑی بھی زیادہ قیام نہ کریں۔

[illegible]

○ شاید اس دن کی صحیح ترین تعریف ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ یہ دن "اللہ کا دن" تھا۔

یہ اللہ کی نشانیوں کا دن تھا..... اس کے معجزات کا دن تھا..... یہ چھٹنی کا دن تھا۔جس نے مومنوں کا رُخ اللہ کی طرف اس طرح پھیر دیا کہ ان کے اندر صحیح معرفت پیدا ہوگئی اور وہ اس کے آگے جھک گئے۔

یہ "اللہ کا دن" تھا..... اس دن ذاتِ پاک کی وہ حکمتیں روشن ہوگئیں جو "محمدؐ ابن عبداللہ" کو رسالت کے لئے منتخب کرنے میں پوشیدہ تھیں۔ اور جو عرب کو خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کو عموماً ازسرِ نو اٹھانے اور بابرکت زندگی عطا کرنے کی غرض سے ان کو قیادت کیلئے کھڑا کرنے کے پیچھے کارفرما تھیں۔

مکہ کے مشرقی کنارے پر، عرب کا ایک ممتاز قبیلہ آباد تھا جو اپنی طاقت جنگی مہارت اور ہمت کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتا تھا ـــــ یہ ہوازن کا قبیلہ تھا۔ ثقیف، نصر اور جُشم کے قبائل نے ان کو للکارا، اور ان سے وعدہ لیا کہ پورا زور لگا کر وہ لوگ مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں..... "ہوازن" اس گمان میں مبتلا ہو گئے کہ جب وہ مسلمانوں پر قابو پا کر اس شکست کی رسوائی کو پلٹ دیں گے تو مکہ اور قریش کے سروں کا تاج بن جائیں گے۔ ساری عزت و بڑائی ان کے حصہ میں آجائے گی۔

فتح کے دن تمام تر اہلِ قریش اور پورا مکہ اطاعت قبول کر چکا تھا۔ جس نے اسلام نہ بھی قبول کیا، اس نے ماتحتی تسلیم کر کے امان لے لی اس طرح پورا شہر مکہ اللہ کے رسول اور

اسلام کے لیئے مرکزِ حمایت میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ایسے میں اگر "ہوازن" اپنے حلیفوں کو ملا کر مسلمانوں کو شکست دیدیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ عرب کی سیادت کے مقام پر فائز ہونے کے سراسر حقدار بن جائیں گے اور ان کی وہی عزت و حشمت تسلیم کی جائے گی جو عربوں میں ابتک قریش کو حاصل تھی۔

چنانچہ (مالک بن عوف النصری) نامی ایک معزز شخص کی ماتحتی میں یہ قبائل اپنے آزمودہ جنگجو جوانوں کا جمِ غفیر لے کر نکل آئے اور امید کر رہے تھے کہ مسلمان اچانک ان سے دوچار ہو کر گھبرا جائیں گے۔

لفظ "قبائل" کی مناسبت سے میں چاہتا ہوں کہ یہاں اپنی کتاب "رجال حول الرسول" سے یہ فقرہ نقل کروں:

"نامناسب ہوگا اگر ہم جنگوں کے مزاج کے متعلق دھوکہ کھا جائیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کے طویل عرصے میں سابقہ پیش آیا، اور ہم یہ سمجھ لیں کہ یہ جنگیں محض چھوٹی چھوٹی، بڑی حملوں جیسی اہمیت کی حامل تھیں ..... کیوں کہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ان قبیلوں کی پناہ گاہوں میں لڑنے سے زیادہ سخت اور خوں ریز جنگیں دوسری نہیں تھیں۔

اس حقیقت کے ادراک سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب نے جو غیر معمولی کاوشیں اور محنتیں صرف کیں ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ملے گا بلکہ اس سے اس فتح عظیم کی قدر و قیمت

کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ مل سکے گا جو اسلام اور مسلمانوں کو نصیب ہوئی ..... ساتھ ہی اس فتح و کامرانی میں جو توفیق الٰہی صاف مائل بہ کرم نظر آتی ہے، وہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہوگی....."

یہ تمام قبیلے اس مغرور شخص کے ماتحت نکل آئے جس نے جنگجو جوانوں کے ساتھ، ان کے مال اور عورتوں بچوں کو بھی باہر کر لیا تھا تاکہ ان کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہو جائے کہ یہ معرکہ درحقیقت پناہ حاصل کرنے یا بے پناہ بن جانے کا فیصلہ کن معرکہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور بے مثال معرکہ ہے۔ اگر اس میں ان کو ہزیمت اٹھانی پڑی تو ان کے لئے، ان کے اہل و عیال اور ان کی نسلوں کے لئے اور ان کے مال و دولت سمیت پورے وجود کے لئے تباہ کن ہوگا۔

ادھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو بھیجا کہ جا کر وہ ان لوگوں کا حال معلوم کریں اور ان کے ارادوں اور تیاریوں کے متعلق خبر دیں۔

آپؐ نے جن کو بھیجا تھا وہ پوری صورتِ حال کی واضح تصویر لے کر آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں جنگ کا بھیانک شعلہ بھڑکانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار کی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو خود آپؐ کے ساتھ مکہ کی فتح کے لئے آئے تھے۔ اب ان کے ساتھ دو ہزار اہل مکہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو فتح کے دن ایمان لائے تھے اور وہ بھی تھے جو اپنے دین پر قائم رہ گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے دن اوجِ کامرانی کے لمحات میں

جس بلند انسانی حیثیت کا مظاہرہ کیا تھا، یہ درحصل اسی کے برکات کی شاندار ظاہری صورت تھی۔!!

اہلِ قریش میں سے جو لوگ اپنے دین سے بھاگنے اور بعد میں اسلام میں داخل ہونے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے، ان کی اس حیثیت کو بھی آپؐ نے تسلیم کر لیا تھا، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپؐ کی راہ میں وہ مر مٹنے پر کمربستہ تھے۔ چنانچہ آپؐ کے ساتھ ساتھ وہ بھی "ہوازن" اور اس کے حلیفوں کے مقابلے کے لئے نکل آئے تھے۔

اس موقع پر لشکرِ اسلامی کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ اتنی بڑی تعداد جس سے قدرتی طور پر غرور پیدا ہونے کا امکان تھا۔ خاص طور سے ایسے موقع پر کہ مسلمانوں نے ابھی کل ہی اس پورے جزیرہ (عرب) کے اس شہر کو فتح کیا تھا جو ایک طرف بُت پرستی کا مرکز تھا تو دوسری طرف خود اسلام اور اسلامی جماعت کے لئے سنگین مخالفت کا مرکز بنا رہا تھا۔

آج یہاں فتح اور کثرتِ تعداد کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اور لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ:

[آج ہم قلتِ تعداد کیوجہ سے مغلوب نہیں ہوسکتے]

قلت .... اور کثرت .... ! اللہ کے سپاہیوں کو بھلا اس حساب سے کیا سروکار ؟!

مگر انھوں نے اپنی ذات کو میزان پر ڈال دیا تھا... جبکہ میزان کل کا کل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے بھاری پلڑے میں اللہ کے فضل کے سوا کچھ نہ تھا جو رسولؐ اور مسلمانوں ہی کے لئے مقدر تھا۔

مسلمان آخر بشر ہی تو ہیں ... اور ظاہر ہے کہ فتحِ مکہ جس حیرت انگیز تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہوئی اس سے اس بات کا امکان تو بہرحال ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ذات

اور اپنی قوت کا دھوکہ ہونے لگے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو بہت جلد ایسا سبق ملے جو، ان کو اس غلطی سے موڑ کر ان کے مدارِ اصلی کی طرف پھیر دے۔ اس مدار کی طرف جو خدائے واحد کے گرد چکر کاٹتا ہے اور خدا کی ذات وہ ذات ہے کہ ان سارے معاملات میں جو بیت چکے، اور جو پیش آنے والے ہیں، سب میں اس کا فضل اور اس کی نوازشیں ہمیشہ مائل بہ کرم رہیں

وادیٔ حنین میں جہاں معرکہ پیش آیا، بہت سے غار، تنگ حلقے اور چھپنے کے گوشے تھے۔ ہوازن اور اس کے حلیف وادی میں پہلے ہی پہونچ کر گھاٹیوں، موڑوں اور گوشوں میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

مسلمان آئے اور اس وادی میں اترنے لگے۔ ان کو ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ ہوازن ان سے پہلے اتر کر پوزیشن لے چکے ہیں..... صبح نمودار ہو رہی تھی اور اپنی کرنیں خموشی کے ساتھ بکھیرنے میں وہ مصروف تھی۔ مسلمان یہ سوچ کر پھولے نہیں سما رہے تھے کہ ہماری تعداد اتنی بڑی ہے۔ وادی کے ڈھلوانوں تک لوگ بھرے ہیں۔

اچانک اسی بے خبری کے عالم تیر، نیزے اور برہنہ شمشیریں ان پر ایک ساتھ برسنے لگیں اتنی برسیں کہ ان کے دل دہلنے لگے۔ ان کی صفوں سے آہ و بکا کا شور بلند ہونے لگا اور سراسیمگی اس طرح پھیلی کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ "اُحد" جیسے خوفناک دن میں بھی منظر ایسا نہ تھا..... !!

اس طرح خدائے علیم و خبیر نے ان کو دکھلا دیا کہ ان کی کثرتِ تعداد خود ان کے کام نہیں آئی۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کو ہرگز اس وحی کو نہیں بھولنا چاہیئے جو، ان کے رسول پر نازل ہوئی تھی کہ :

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ (سورہ انفال آیت ۱۰) اور فتح و کامرانی بس اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔

تقدیر الٰہی نے ان کو اپنے مخصوص پیرائے میں اس سبق کی تلقین کردی...

پھر اسی لمحے ایک دوسرا نیا سبق ان کو دیا گیا.... :

وہ یہ کہ جب ان کی صفیں درہم برہم ہوگئیں، اور وہ لوگ اُس کشادہ حلقے سے بھاگنے لگے جہاں سے ہوازن اپنی کمین گاہوں میں ڈٹے حملے کر رہے تھے۔ فقط ایک ذات اللہ کے رسولؐ کی تھی جو ثابت قدمی کا پیکر بنی کھڑی تھی کہ انسان تصور نہیں کر سکتا ہے... آپؐ کھڑے اونچی آواز سے پکار رہے تھے، اس بات سے قطعی بے خوف کہ آپؐ کی آواز سے دشمنوں کو آپؐ کی موجودگی کی جگہ کا علم ہوجائے گا اور وہ آپؐ پر حملہ کر دیں گے۔ آپؐ فرما رہے تھے۔

"لوگو! کہاں جا رہے ہو؟

آؤ، میری طرف آجاؤ!

میں اللہ کا رسول ہوں،

میں محمدؐ بن عبداللہ ہوں،

میں نبی ہوں اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں"

میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔"

آپؐ کے ساتھ اور آس پاس اس وقت ابوبکرؓ، عمرؓ... آپ کے چچا عباسؓ، چچازاد بھائی علیؓ، اسامہ بن زیدؓ.... ابوسفیانؓ بن حارث اور اس کا بیٹا!... فضلؓ بن عباس اور ان کے بھائی قثمؓ، ربیعہ بن حارثؓ اور ایمن بن عبیدؓ کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا تھا

ہاں ! ان دس گیارہ صحابہ کے درمیان رسولؐ تنہا اس خوفناک وادی کے قلب میں ڈٹے رہ گئے، عین اس جگہ جہاں سے ہوازن کے سیکڑوں جنگجو جوان حملے کر چکے تھے۔ ان کے سروں کے اوپر ان کا سیاہ پرچم لہرا رہا تھا، اور ان کے ہاتھ موت کی شمشیروں اور نیزوں سے وار کر رہے تھے ......!!

اس خوفناک مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدم رہے۔ تاکہ آپ کا ثبات قدرت کی جانب سے اس بات کی علامت بن جائے کہ ـــــ آپؐ اپنے تمام غزوات میں اپنی فوج کی شجاعت سے قوت حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ خود فوج اپنی شجاعت و ثبات کے لئے آپؐ سے قوت حاصل کرتی تھی۔

..... اس حقیقت کو بہترین پیرایہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یوں بیان کیا:

جب گھمسان کی جنگ ہونے لگتی اور میدانِ جنگ گرم ہو جاتا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قوت و حمایت حاصل کرتے تھے۔"!!

عبد المطلب کا بیٹا کھڑا ہو کر پکارنے لگا:

"میں نبی ہوں، اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں ہے"

اور اپنے چچا عباسؓ کو ــــــ جو بڑی ڈیل ڈول اور اونچی آواز کے مالک تھے ــــــ فرمایا کہ آپ بھی آواز دیں۔ تو وہ لگے چیخنے:

"اے گروہِ انصار!"

"اے بیعت والے لوگو!"

جب اللہ کے رسولؐ اور آپ کے چچا کی آوازیں ان لوگوں کے کانوں سے ٹکرائیں

جو ہوازن کے حملے سے منتشر ہو چکے تھے، تو وہ اس طرح پلٹ پلٹ کر آنے لگے گویا کہ اب یہ پہاڑ بن کر اس گھاٹی کو پیس ڈالیں گے، اس بار ان کی تلواروں، نیزوں اور تیروں کا یہ انداز تھا کہ گویا وہ ہوازن اور ان کے حلیفوں کو یا تو موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لیں گے یا پھر قید کر کے ہی رکیں گے۔ چنانچہ اس جوش میں انھوں نے ان کو اپنے نرغے میں اس طرح لیا کہ اس منظر کو دیکھ کر اللہ کے رسولؐ بھی جوش اور سرور کی کیفیت سے سرشار ہو گئے اور پکار اٹھے:

["البتہ جنگ کا بازار اب گرم ہوا ہے"]

اللہ کی راہ میں لڑنے والے گھوڑے ہنہنانے لگے، اور اپنے قہر اندام کھروں کے نیچے لات اور ہوازن کے گھوڑوں کو کچل کچل کر فنا کرنے لگے۔

اس طرح حنین کا دوسرا سبق کامیابی کے ساتھ پورا ہوا.....

اس کے بعد ہی وہ وقت بھی آیا جب وحیٔ الٰہی نے اس غلبہ کو اپنی چند آیتوں میں تیار کیا ہوا ریکارڈ یوں پیش کیا:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ	اور غزوہ حنین کے روز دیکھو، اس روز تمہیں
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا	اپنی کثرتِ تعداد کا غرور تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام
وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا	نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ	تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے پھر اللہ نے
ثُمَّ أَنْزَلَ سَكِينَتَهُ عَلَى	اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر
رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ	نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم
وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا	کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ | سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔

(سورہ توبہ آیت ۲۵-۲۶)

اس مقام شواہد میں اللہ نے روشن کر کے دکھایا کہ کیسے بے مثال جوہر میں سے اللہ اپنے رسولوں کو منتخب فرماتا ہے .... اور اس مقام شواہد میں اس نے اپنے معجزہ اور اس کا عملی ثبوت بھی عیاں فرما دیا ۔ آخر وہ کون تھا جس نے رسولِ خدا کو محفوظ بچا لیا جب کہ وہ سیکڑوں تلواروں، نیزوں اور تیروں کے درمیان تن تنہا رہ گئے تھے اور موت یقینی بن چکی تھی؟

آئیے! یہاں صرف ایک شہادت کو ہم بطورِ مثال پیش کریں۔ شیبہ بن عثمان بن ابی طالب کا باپ مسلمانوں کی تلواروں سے جنگِ احد میں قتل ہو گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ:

میں نے دل میں سوچا، آج میں اپنے تیر محمدؐ کے خون سے رنگوں گا.... آج میں محمدؐ کا خاتمہ کر ڈالوں گا..... چنانچہ میں ان کے قریب ہو گیا تاکہ ان پر وار کروں۔ مگر اسی لمحے مجھے ایسا لگا کہ میرے دل کو کوئی چیز ڈھانکتی جا رہی ہے اور میں اس سے بے بس ہوتا جا رہا ہوں۔ اپنی اس حالت کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے بچا لئے گئے۔!!

آخر وہ کون تھا جس نے کھلی ذلت و بے بسی کو پل جھپکتے ہی بے دست و پا شخص کی فتح میں تبدیل کر کے رکھ دیا....؟

بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کے سچے معجزے تھے:

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ — اور اللہ اپنے کام میں غالب رہنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

اس معرکہ میں مشرکوں کے لاتعداد مقتولوں کا ڈھیر لگ گیا..... چھ ہزار آدمی اسیر بنے .... بے پناہ سمندر کی طرح مالِ غنیمت کا کوئی ٹھکانہ، نہ تھا۔لشکرِ شرک کا سالار (مالک بن عوف النضری) بھاگ کھڑا ہوا، اور شکست خوردہ لوگوں کا ایک گروہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔یہ لوگ طائف کے قلعے کی پشت پر جا کر ٹھیرے، غم سے نڈھال اور نیند سے محروم تھے، اسلامی لشکر بھی ان کا پیچھا کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔اور چاروں طرف سے طائف کو اپنے مضبوط حصار میں لے لیا۔

کیا تم نے سمجھا، کیوں رسول ــــ علیہ السلام ــــ نے شکست خوردہ فوج کا پیچھا کیا اور طائف پر محاصرہ قائم کر دیا ...؛ جبکہ آپؐ کو ہم نے دیکھا ہے کہ آپؐ اپنی جنگی کارروائیاں محض بقدرِ ضرورت، کم سے کم عمل میں لاتے رہے ہیں.... ؟؟

آپؐ نے اس شخص کا پیچھا کیا اور اس کے نئے پڑاؤ کو گھیرے میں لے لیا۔یہاں سلامتی ورحمت کی حکمتِ عملی کو بدلا نہیں گیا تھا، بلکہ اس کو زیادہ پختہ اور مستحکم بنا دینا پیشِ نظر تھا کیوں کہ ممکن تھا کہ طائف میں یہ بھاگی ہوئی فوج اور اس کا یہ مغرور سپہ سالار مل کر ازسرِ نو تنظیم کر کے فتنہ کو جگا دیں اور جنگ ایک بار پھر زندہ ہو جائے۔اور ثقیف کے لوگ جو، ان کے حلیف تھے، ان کا ساتھ دے کر آگ پر تیل کا کام کریں۔

چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باور نہیں کیا کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے

اور وہ دوبارہ جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہونے سے باز آگئے ہیں یا بالکل بے بس ہو چکے ہیں، اسی لئے آپ نے یہ موقف اختیار کر لیا۔ اس حکمتِ عملی سے ہمیں یومِ حنین سے یہ تیسرا سبق حاصل ہوا اور لس کی ایک اور اہمیت معلوم ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً بیس دنوں کے بعد طائف کا حصار اٹھا لینے کا حکم دیا۔ اس موقع پر بعض صحابہؓ نے زور دیا کہ آپؐ ثقیف کے لوگوں کو بلائیں اور ان کو لعنت ملامت کریں۔ یہ سن کر آپؐ نے آسمان کی طرف عاجزی کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھا لئے:

اے اللہ ثقیف کو ہدایت فرما دے

اور ان کو مسلمان بنا کر لے آ۔!!

آپؐ طائف سے لوٹ گئے۔ جب (جعرانہ) پہونچے تو اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں آپؐ کے پاس ہوازن کا ایک وفد ملنے آیا...... وہی قبیلہ جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس طرح پیش آیا تھا اور اتنی خوں ریز جنگ چھیڑ دی تھی۔

اس قبیلہ کا وفد حضورؐ سے یہ گذارش کرنے آیا تھا کہ آپؐ اسیروں کو رہا کر دیں۔ ان اسیروں میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔ ان کے سالارِ فوج (مالک بن عوف نصری) نے لشکر کے ساتھ ساتھ ان عورتوں اور بچوں کو بھی گھروں سے باہر لا کر رکھ دیا تھا تاکہ ان کو دیکھ کر جوانوں کے اندر غیرت جوش مارنے لگے اور وہ جان کی بازی لگا دیں۔ اس گذارش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو آزاد کر کے ان لوگوں کے حوالے کر دینے کا حکم فرما دیا۔

اچھا تو پھر اس فتنے کے سالار (مالک بن عوف) کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے کیا برتاؤ کیا تھا.... ؟؟

یہی شخص محمدؐ کا سر لینے .... اللہ کے دین کا قلع قمع کرنے .... اور مسلمانوں کی جڑ کاٹ دینے کے لئے نکلا تھا۔؟؟

دیکھ لو ، ہر زمان و مکان میں اس روئے زمین پر بسنے والو ! .....

رسولؐ ہوازن کے وفد سے دریافت فرماتے ہیں :

مالک بن عوف کہاں ہے .... ؟؟

جواب ملا : "وہ طائف میں ثقیف کے ساتھ ہے"

آپؐ اس بات پر قادر تھے کہ کسی کو وہاں بھیج دیتے جو جاکر اس کو قتل کر دیتا یا قید کر لاتا ..... بلکہ آپؐ تو اس پر بھی قادر تھے کہ ان کے قیدیوں کو چھوڑنے کیلئے ایک شرط رکھ کر خود ہوازن کے وفد سے یہ خدمت لے لیتے۔ لیکن آپؐ نے وہ کام کیا جس کو کرنا آپؐ کے سوا کسی کے ظرف کی بات نہ تھی ـــــــ صلی اللہ علیہ وسلم ....

آپؐ نے وفد سے فرمایا :

مالک کو خبر بھیج دو کہ وہ میرے پاس سپردگی اختیار کر کے آجائے تو میں اس کے اہل و عیال اور اس کا مال سب واپس کر دوں گا۔ بلکہ اپنی طرف سے ایک سو اونٹ اور بھی عطا کروں گا"

محض اس کی زندگی کو امان نہیں دیا جا رہا تھا بلکہ اس کو وہی سامانِ عیش بحال کیا جا رہا تھا جو اپنے قبیلہ کے ایک سردار کی حیثیت سے قبل اس کو حاصل تھا .... !!

اس وفد نے مالک کے پاس جاکر یہ خوشخبری سنادی ..... وہ تو سر کے بل رحیم و شفیق

رسولِ خدا کے پاس عاجزی کے ساتھ حاضر ہوگیا، اس نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام میں بہت آگے بڑھ گیا بلکہ اس کو ہدایت اور اسلام سے جو فرحت حاصل ہوئی، اس کو اس کے قصیدے سے سمجھا جاسکتا ہے، جس میں اس نے کہا ہے

"تمام کے تمام انسانوں میں مَیں نے محمدؐ جیسا نہ تو کسی کو دیکھا، نہ کسی کے متعلق سنا۔

جب اس سے سوال کیا جائے تو وہ بخشش دینے میں پورا پورا اور بہت دینے والا ہے۔ اور جب تم چاہو، تم کو کل پیش آنے والی باتوں کی خبر دے دیگا۔"

کیا یہ جنگ اور سختی کا رسولؐ ہے ...... یا سلامتی اور محبت کا پیامبر.....؟؟

بے شک یومِ حنین سے .... قضیۂ "اسلام اور جنگ" اور امورِ جنگ میں اسلامی اخلاقیات کی ٹھیک ٹھیک توضیح و تفسیر ملتی ہے .... اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس دن نے عفو و درگذر، شرافت اور بلندی کے بہت سے مناظر دیکھے .... بلکہ اس سے قبل جو روّیہ مشرکوں نے اس بدلہ کے دن اختیار کیا، اس کی وجہ سے بھی۔

حنین کے دن مشرک جنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے، اس سے روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو کن حالات و ظروف میں اپنے دین اور خود اپنی ذات کی حمایت و دفاع میں تلوار اٹھانے اور معرکہ سر کرنے کا نہایت ناگوار فریضہ انجام دینا پڑا جب کہ فتح کے بعد توقع یہ تھی کہ بت پرستی کا شور سدا کے لئے بند ہو جائے گا، خود جنگ اپنے

ہتھیار ڈال دیں گے اور مسلمان اپنی تلواریں گہری خموشی کے سپرد کر ڈالیں گے۔

لیکن شر نے اپنے اندر بدترین حادثہ چھپائے رکھا تھا۔ چنانچہ جو جھنڈا گر چکا تھا اس کو دوسرے قبائل نے اٹھالیا۔ اور ایک بھاری لشکر کی شکل میں اسلام اور اہل اسلام سے ٹکر لینے کے لئے امڈ آئے۔

ایک شکل تو یہ تھی جو پیدا ہوئی ..... دوسری شکل وہ تھی جو "غزوہ تبوک" نے پیدا کی جب روم جزیرۂ عرب کی حدود (BORDARS) پر ریشہ دوانیاں کر رہا تھا.... ان دو شکلوں سے یہ بات تو بہرحال کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام کا جنگی موقف درست اور برحق ہے بالکل اسی طرح جیسے جنگ کے سلسلے میں اس نے اپنے ذمہ دار لوگوں کے لئے اعتدال، رحم اور سلامتی کی پالیسی مقرر کر رکھی ہے۔!!

"یوم حنین" کو جلد ہی یہ شرف حاصل ہوا کہ جب معاملات اختتام کو پہنچ رہے تھے تو اس دن نے ایک اور عجیب و غریب بات دیکھی۔

اللہ کے رسولؐ تو ٹھان ہی چکے تھے کہ اس دن کو "اللہ کا دن" بنانا ہے۔ اور آپؐ اللہ کی مدد کو اپنی نظروں کے سامنے مجسم دیکھ چکے تھے۔ اس لئے آپؐ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے ربِّ عَلِیٌّ وَکَبِیْر کا شکر کس طرح ادا کریں!

معرکۂ حنین کا خاتمہ فتح پر ہوا تھا، اور ہر وہ جنگ جو فتح پر جا کر ختم ہوتی ہے، اسکے بعد ہی فوری طور پر سلامتی کے کچھ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے مشکل مسئلہ ۔ جنگی مال غنیمت کا مسئلہ ہوتا ہے۔

مالِ غنیمت مسلمان مجاہدوں کی نسبت سے اہم اور جوابدہی کے حقوق عائد کر دیتے ہیں .... کیوں کہ اس موقع پر یہ ایک معیشت اور رزق کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

اور حنین کے دن، مالِ غنیمت بڑی کثرت کے ساتھ موجود تھا ....

یہاں اونٹ اور بھیڑ بکریاں ہزاروں کی تعداد میں موجود تھیں جو نظروں میں چڑھی ہوئی تھیں اور لوگوں کے منہ میں پانی آرہا تھا...... اِدھر شروع دَور کے مسلمان ایکدوسرے اپنے اپنے حصوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے اور اُدھر اللہ کے رسولؐ جو حنین کے دن کو "اللہ کا دن" بنانے کا تہیّہ کر چکے تھے، وہ فتح کے دن اسلام قبول کرنے والوں کو بلا بلا کر تالیفِ قلب کے لئے علی الحساب مالِ غنیمت اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے کیوں کہ اس دن ان کا قبولِ اسلام مفاد اور لاچاری پر ہی مبنی تھا، ایثار اور اخلاص کے تحت نہیں تھا۔ جب مال بہت کم بچا تو بعض مہاجر فقراء میں تقسیم کرنے لگے ...... !!

باقی رہے انصار، شروع دَور کے مسلمان اور بڑے بڑے لوگ، تو وہ ایک دوسرے سے مالِ غنیمت کے متعلق مل مل کر اظہارِ شکایت کر رہے تھے۔

یہ ایک ایسی افتاد تھی جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کو تیار کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں آیا تھا۔ اور فتح کی بھیڑ، لوگوں کی بھیڑ اور پھر مالِ غنیمت کی بھیڑ، ان سب سے آپؐ کو فرصت ہی نہیں ملی کہ جو کچھ کیا گیا تھا اس کی تفصیلات سے لوگوں کو آگاہ کرتے، اسلئے قدرتی طور پر ایک دوسرے سے سوال کرنے کا موقع پیدا ہو گیا۔ بلکہ افسوس اور تلخی کا احساس بھی ظاہر کیا جانے لگا۔ خاص کر انصار کی طرف سے جن کا ایک فرد بھی مالِ غنیمت میں سے کچھ بھی نہ پا سکا۔

اسی احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے مسلمانوں اور انصار کے شاعر "حسان بن ثابتؓ"
نے کہا ہے :

"رسولؐ کے پاس آؤ اور کہو کہ آپؐ مومنوں کے بہترین امانت دار
ہیں آپؐ جب انسان گنے گئے۔
وہ کیا خصوصیت ہے کہ سُلَیم کو بلایا جا رہا ہے جب کہ وہ
دور ہے۔ اس کو ایسے لوگوں کے مقابلے میں بلایا جا رہا ہے جنھوں
نے آنسو بہائے، پناہ دی اور مدد کی۔
اللہ نے ان کو انصار کا لقب دیا کیوں کہ انھوں نے دینِ
ہدایت کی مدد کی اور جنگ میں ساتھ دیا جب کہ وہ بھڑک اٹھی۔"

انصار کے سردار" سعد بن عبادہؓ" رسولؐ اللہ کے خیمے میں داخل ہوئے اور کہا:
"اے اللہ کے رسولؐ! فئی کے معاملے میں آپؐ نے جو کچھ کیا، اس پر قبیلۂ انصار
کو اپنے متعلق شکایت ہے۔"

اللہ کے رسولؐ نے دریافت فرمایا :
"سعد بتاؤ، خود تم کس حال میں ہو؟"

سعد نے کہا :
"میں اپنی قوم سے باہر کب ہوں؟"

اس جواب کے بعد آپؐ نے ان کو حکم فرمایا کہ جاؤ اور انصار کو میرے نام پر جمع کرو۔
سعد نے جا کر انصار کو جمع کر لیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے تشریف

لائے اور کھڑے ہو کر تقریر شروع کی :۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا !

"اے گروہِ انصار ! یہ کیسی بات ہے جو تمہارے متعلق مجھ تک پہونچی ہے۔ تمہارے دلوں میں میرے خلاف شکوہ اور غصّہ پیدا ہو گیا ہے ؟

کیا میں تمہارے پاس اُس وقت نہیں آیا جب تم گمراہ تھے تو اللہ نے تم کو ہدایت دی .... کیا تم تنگدست نہ تھے کہ اللہ نے تم کو غنی بنا دیا .... کیا تم ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے کہ پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا ؟"

انصار کے لوگ چیخ کر بول اٹھے :

"ہاں ! اللہ اور اس کے رسولؐ بہت احسان اور فضل والے ہیں۔"

پھر رسولؐ اللہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا :

"اے انصار ، کیا تم لوگ مجھے ایک بات کا جواب نہ دو گے ؟"

لوگوں پر حیا غالب آگئی ، آخر دریافت کیا :

"اے اللہ کے رسولؐ ! ہم آپؐ کو کس بات کا جواب دیں ؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کا تو ہم پر بہت بڑا احسان اور فضل ہے۔"

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا :

"خدا کی قسم ، اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو ، اور یہ کہنے میں تم سچے ہو گے ، تمہاری ایک ایک بات قابلِ تصدیق ہو گی کہ :

"آپؐ اس حال میں آئے تھے کہ آپؐ کی قوم نے آپؐ کو جھٹلایا تھا ، اس وقت ہم نے

آپؐ کی تصدیق کی .... آپؐ کو رسوا کیا گیا تھا، جب کہ ہم نے آپؐ کی مدد کی... آپؐ کو نکال دیا گیا تھا، جب کہ ہم نے آپؐ کو پناہ دی .... آپؐ مفلس تھے تو ہم نے آپؐ کو مالی سہارا دیا.....

اے گروہِ انصار، کیا تم اپنے دلوں میں شاکی اور غضبناک ہوئے دنیا کے ایک گھونٹ کے لئے جس کو ہم نے اسلام لانے والی ایک قوم کے لئے تالیفِ قلب کا ذریعہ بنایا اور خود تم کو چھوڑ دیا تمہاری نعمتِ اسلام کے ساتھ ......؟؟

اے گروہِ انصار، کیا تم اس بات سے راضی نہ ہوگے کہ اور لوگ تو بکریاں اور اونٹ لے کر جائیں ..... مگر تم جب اپنی سواریوں پر واپس جاؤ تو اللہ کے رسولؐ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ.....؟؟

اس ذاتِ پاک کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر میرے ساتھ ہجرت کا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو میں خود کو انصار کا ایک فرد کہتا۔ اور اگر لوگ گروہوں میں تقسیم ہوں تو میں خود کو انصار کے گروہ میں رکھوں۔ اے اللہ تو انصار پر رحم فرما، انصار کی اولاد پر رحم فرما.... اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔ !!!

جب انصار نے اتنی زبردست دعا سنی تو وہ صادق و امین عَلَیْہِ السَّلام پر فخر کے جذبہ سے اتنے سرشار ہو گئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور گریہ وزاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

اللہ کے رسولؐ نے آج اس "اللہ کے دن" میں ان کو بہت بلند اٹھا دیا تھا، اس عظیم دن کی انتہائی بلندی پر۔ اور جو کچھ کیا گیا تھا اس کی وضاحت تمام مسلمانوں کے سامنے

کھول کر رکھ دی ..... آپؐ چاہتے تھے کہ آج اس عظیم دن میں خود اپنی ذات کو اور تمام صحابہ کرامؓ کو تمام مادی اسباب سے کاٹ دیں اور صرف اللہ رب العالمین کی ولایت اور سرپرستی کے سہارے پر رکھیں ـــــ یہاں تک کہ غنیمت اور فیئ میں ان کے شرعی واجب حق کو بھی پس پشت ڈال دیں تاکہ یہ "اللہ کا دن" ـــــ مکمل طور پر اسباب سے بے تعلقی اور کنارہ کشی کا بھی ایک دن بن جائے۔! اس سے آپؐ کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں اور تمام لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگرچہ مالِ غنیمت میں مجاہدوں کا شرعی حق ہے اور یہ خود ان کی معاشی ضرورت اور ان کی روزی کے لئے ایک سہارا ہے، مگر آں کا بذاتِ خود مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے مقصد میں اس مقصد کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔!!

تنے تمام غزوات میں سے کسی غزوہ میں اس سبق کی تلقین اتنی بڑی، اتنی گہری جڑ کاٹنے والی اور اتنی ذہن نشین ہونے والی ثابت نہیں ہوئی جتنی اس غزوہ حنین میں نظر آتی ہے۔

اس غزوہ میں سونے چاندی، اونٹ اور بکریوں کی جتنی غنیمت حاصل ہوئی اس سب پر خالص رضائے الٰہی کی غرض کو فوقیت حاصل تھی اور ضرورت تھی کہ اس کے تعلق سے زہد اختیار کیا جائے۔ اور غیر معمولی روحانی قوت کی خاطر ان تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو رہا جائے۔ اللہ کے رسولؐ کی خواہش تھی کہ آپؐ کے اصحاب و انصار اس غیر معمولی روحانی قوت کو اس عظیم خدائی دن میں حاصل کر لیں۔

اسی سلسلے کی چیز تھی مالِ غنیمت کو چھوڑ دینا، مگر اس کے متعلق خود عقل و خرد رکھنے والے لوگ بھی دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی تالیف قلب کے لئے اس مال کو بانٹ دینا اسلام کی ایک نرالی اور غیر معمولی بات تھی جبکہ مہاجرین اور انصار کے سابقین اولین کے لئے اللہ کی پناہ،

اس کی رضامندی، فردوس ایمان اور دوسری جنتوں کو چھوڑ دیا گیا تھا۔!

آپؐ سے قبیلۂ غفار کے ایک صحابی جعیل بن سراقہ ضمریؓ" کے متعلق سوال کیا گیا کہ آپؐ نے کم از کم ان کو کیوں نہ دیا؟ جب کہ آپؐ نے عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس کو دیا جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے؟

رسولؐ اللہ کے پاس اس کا جواب یہ تھا:

"قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے، جعیل بن سراقہ تو عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس جیسے روئے زمین پر بھرے لوگوں سے بدرجہا بہتر ہے..... لیکن ..... میں نے ان دونوں کو تالیف قلب کے لئے دیا تاکہ وہ اسلام کو قبول کرلیں ..... اور ہم نے جعیل بن سراقہ کو ان کے اسلام کے سہارے چھوڑ دیا....."

بالکل درست! ..... آپؐ نے تو اپنے پاکیزہ صحابہ کے لئے ان کے ایمان، ان کی پرہیزگاری اور ان کی خدا پرستی ہی کو اس دن کا عطیہ بنا دیا۔

اور آپؐ کا جو بھی عطیہ تھا بس وہی کافی تھا..... اور آپؐ جو بھی بدلہ دیتے وہ بھی کافی تھا.....

یومِ اختیار

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ .....

اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو....

(سورۂ احزاب: ۲۸-۲۹)

○ یہاں زمانہ اپنے خزانوں کو کھول دینے کے لئے بے تاب ہے تاکہ رسول اللہ کی زندگی کے عظیم ایام میں سے اس پُر جلال اور قابل فخر دن کو پیش کر دے۔

وہ ایسا دن ہے جس کا تقاضا ہے کہ ہم اس میں پیش آنے والے واقعات سے تیزی کے ساتھ فیضیاب ہولیں۔ ہم کو ان واقعات کا جو ماحصل ملتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ اپنی ازواج مطہرات سے ناراض ہوئے کیوں کہ انھوں نے آپؐ سے مطالبہ کیا تھا کہ زندگی کی نعمتوں میں ان کے لئے کشادگی عطا کی جائے۔ رسولِ خدا نے اس بات کو ماننے سے انکار فرما دیا۔ پھر وحی بھی آپؐ کے موقف کی تائید میں نازل ہوئی جس میں جھڑکی اور دھمکی کے لہجہ میں آپؐ کی ازواج پر خفگی کا اظہار کیا گیا تھا۔[1]

اس بات سے علی الرغم کہ اگر ان واقعات پر تیزی سے نظر ڈالتے ہوئے ہم گذر جائیں تو ان کے اندر جو نادر و کمیاب عظمتیں پوشیدہ ہیں، ان کے اظہار کے لئے یہ کافی ہو گیا نہیں، ایک اہم بات یہ ہے کہ واقعات پر اچٹتی نظر اور ان واقعات کی خارجی شکل کے پیچھے ایک حیران کن معاملہ ہے جس سے قلوب اثر پذیر ہوں گے اور بہت جلد اپنی جگہ چھوڑ کر اچھلنے پھاندنے اور اڑنے لگیں گے....!!

لیکن موضوع کی طرف رُخ کرنے سے قبل، ضروری ہے کہ ہم لفظ " ازواج " کے پاس تھوڑی دیر رکیں کیوں کہ خود شکوک میں گرفتار اور دوسروں کے اندر شبہات پیدا کرنے والے کچھ لوگوں نے حد سے تجاوز کر کے اس لفظ سے طعن و تعریض کا ایک عنوان پیدا کر لیا ہے۔ یا پھر ان کے موقف کے لئے ذرا خوبصورت لفظ استعمال کریں تو کہیں کہ انھوں نے اس لفظ کو " سوالیہ نشان "

---

[1] اس واقعہ کے وقت آپؐ کی زوجیت میں صرف چار بیویاں تھیں:۔ حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ (احکام القرآن ابن عربی ج ۳) ———— (مترجم)

بنالیا ہے۔

وہ یہ سوال پیدا کرتے ہیں کہ : رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی تعداد اتنی زیادہ کیوں تھی .....؟؟

ان کے اس سوال کے جواب میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس قضیہ کے متعلق حقیقت کو واضح طور پر بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

رسولِ خدا ــــ علیہ السلام ــــ کو چالیس سال کی عمر میں مبعوث کیا گیا۔ اور مدینہ کی ہجرت بعثت سے تیرہ سال بعد ہوئی ــــ جب آپؐ ترپن سال کے تھے۔ آپؐ کی عمر مبارک کی اس مدت میں آپؐ کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں نہیں تھیں ــــ یعنی حضرت سیدہؓ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا......

اور ان کے انتقال کے بعد آپؐ نے ــــ شادی کے مقصد سے ــــ صرف ایک شادی کی ــــ سودہ بنت زمعہؓ سے۔ اور مدینہ ہجرت کرنے تک آپؐ نے صرف ان ہی پر اکتفا کیا۔ البتہ مدینہ پہونچ کر حضرت عائشہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا کو اپنی زوجیت میں لیا۔

تنہا یہی حقیقت اس طرح کے ہر سوال کو باطل کر دیتی ہے۔ اور اسی سے مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ رسولؐ خدا کی زندگی میں متعدد ازواج کا ہونا، دراصل دوسری اغراض کے تحت تھا۔ اس کا جنسی خواہشات کی رغبت سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

دوسری حقیقت جس سے بات بہت وزنی بن جاتی ہے، وہ یہ سامنے آتی ہے کہ حضرت عائشہ کو چھوڑ کر آپؐ کی تمام ازواج وہ خواتین تھیں جن کی اپنے شوہروں سے جدائی

ہو چکی تھی ـــــ اور ان میں سے نصف بوڑھی تھیں.

تیسری حقیقت جو سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ ـــــ خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد ـــــ آپؐ کی تمام ازواج جن سے آپؐ نے شادیاں کیں، ان میں سودہؓ کے سوا سب ہجرتِ مدینہ کے بعد زوجیت میں آئیں. یعنی ان ایام اور سالوں میں جب آپؐ اپنے شب و روز مسلسل شور و ہنگامہ کے حالات میں گذار رہے تھے۔ نہ تو مدینہ کے منافقین سکون لینے دے رہے تھے، نہ مشرکین قریش ..... اور نہ ہی فتح مکہ کے بعد ہوازن اور ثقیف نے چین لینے دیا. پھر جب پورا جزیرۂ عرب زیرنگوں ہو کر اسلام کے تحت آ گئے تو اس کے بعد روم کی جنگوں نے بھی اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا.

ایسی حالت میں، اس تعددِ ازدواج کا راز آخر کیا ہوسکتا تھا... ؟ ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں متعدد ازواج ہونے کے پسِ پردہ دراصل شرافت، پناہ نوازی اور جوابدہی کا گہرا احساس کارفرما تھا.

بلکہ یہ کہنا بھی درست ہے کہ: رسولؐ اللہ کی زندگی میں جو شادیاں ہوئیں ان میں شادی کی غرض سے تو صرف دو شادیاں ہوئیں.

پہلی بار حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی شادی،

دوسری بار حضرت عائشہؓ سے شادی، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد.

رہیں بقیہ دوسری شادیاں، تو ان کے پیچھے شادی کرنے کے ارادہ کے ماسوا کوئی نہ کوئی دوسرے اسباب تھے. اور سچ تو یہ ہے کہ اکثر شادیاں آپؐ نے پناہ دینے یا پرورش کرنے کی غرض سے کیں.

اور غالباً اسی مفہوم کی وضاحت درج ذیل آیت میں کی گئی ہے جس میں نبیؐ کے متعلق کہا گیا ہے:

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ (سورہ احزاب آیت ۵۱)
اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو۔

آپؐ ان معزز خواتین کے لئے پناہ دینے والے اور پرورش کرنے والے تھے۔ کیوں کہ وہ جن حالات میں پڑی تھیں ان کا تقاضا تھا کہ اونچی سطح کی پناہ اور پرورش کا بندوبست ہو۔ چنانچہ آپؐ نے ان تقاضوں کو پورا کیا، مثلاً:

حفصہؓ ان کے شوہر غزوہ بدر میں شہید ہوئے۔ تب سے ایک طویل عرصہ گذر گیا آپ بیوہ بیٹھی رہیں۔ اور نبیؐ دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیوگی سے ان کے والد عمر ابن خطابؓ (جو حضورؐ کے بہترین اور معتمد ترین ساتھی بھی تھے۔) کے لئے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ان مشکلات کے پیشِ نظر انھوں نے ابوبکرؓ سے گذارش کی تھی کہ وہ شادی کر لیں مگر انھوں نے معذرت کر لی تھی .... پھر عثمانؓ سے بھی درخواست کی تھی ...... آخر اللہ کے رسولؐ نے ان کی عصمت کو پناہ دی۔

سودہؓ یہ اور ان کے شوہر (سکرانؓ بن عمرو) اسلام لائے اور حبشہ کی ہجرت کی۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے راستہ میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی تمنا تھی کہ باقی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں گذار دیں۔ چنانچہ آپؐ نے ان سے شادی کر لی

ام حبیبہ بنت ابوسفیانؓ یہ اور ان کے شوہر عبید اللہؓ بن جحش

ایمان لائے اور حبشہ کی ہجرت کی۔ حبشہ میں ان کے شوہر نے دین بدل لیا تھا اور نصرانیت کو گلے لگالیا تھا۔ ان کی خبر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہونچی تو ایک تنہا عورت غیر ملک میں ـــــ ہجرت کی سرزمین میں تھیں، اس افتاد سے آپؐ قدرتی طور پر بہت فکر مند تھے۔

یہ وہی خاتون تھیں جو اپنے کنوارے پن میں ایسے وقت میں اسلام لائیں جب ان کے والد اور تمام سرپرست مسلمانوں کے خلاف دشمنی کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔

کیا اس موقع کی مناسبت سے ان کی جس تعزیت اور تکریم کی ضرورت تھی، اس کی اس سے بہتر کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ رسولؐ ان کو اپنے ساتھ ضم کرلیں۔ ....؟

چنانچہ آپؐ نے یہ کر ڈالا۔ آپؐ نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو خبر دی کہ ام حبیبہ رضؓ کے ساتھ آپؐ کی شادی کردیں.... چنانچہ نجاشی نے بعض مہاجرین اسلام کو دعوت دی اور ان کو عقدِ نکاح کا گواہ بنالیا اور خود انھوں نے اپنے پاس سے نبیؐ کے قائم مقام بن کر مہرِ عروسی ادا کردی ..... !!

یقیناً اس واقعہ نے ہمارے سامنے ایک ایسی مثال پیش کی ہے کہ یہ شادیاں کس طرح ان خواتین کے لئے پناہ بننے اور مہربان ہونے کے نتیجہ میں روبہ عمل آئی تھیں۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے جب شادی کی تو وہ آپؐ سے دور تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس شادی کے پیچھے جنسی مقصد نہیں تھا۔ کیونکہ آپؐ ایک ملک میں تھے اور وہ ایک دوسرے ملک میں تھیں۔ اور شادی کے دو سال بعد تک دور رہیں.... جب ان کا شوہر اپنے ارادہ کے مطابق کام کرچکا تو آخر آپؐ کو یہ سوچنا پڑا کہ ان کو مشکل حالات کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ دیا جائے جن میں اجنبی ملک میں وہ مبتلا ہوگئی تھیں

اسی لئے آپؐ کو یہ تہیہ کرنا پڑا کہ ان کے لئے آپؐ کے بس میں جو کچھ کرنا ممکن تھا وہ کر ڈالیں یہ وہ عظیم خاتون تھیں جنھوں نے اللہ ورسولؐ کے لئے ہجرت اختیار کی تھی جبکہ آپؓ کے والد بزرگوار اور اپنے لوگوں کے گھروں میں نعمتیں، آسودگی اور خوشحالی میسّر تھی..... اسی لئے آپؐ کی نظر میں ان کی تکریم کی اس سے بہتر کوئی دوسری صورت نہیں تھی آپؐ ان کو اپنی ازواج مطہرات میں شامل فرمالیں۔

زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی لڑکی..... حسب ونسب اور جمال والی۔ رسولؐ اللہ نے ان کا نکاح حضرت زید بن حارثؓ سے کردیا تھا جو ایک غلام تھے اور رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کردیا تھا۔

اگرچہ زینبؓ اس شادی سے مطمئن نہیں تھیں لیکن بہرحال انھوں نے تلخی بھی ظاہر نہیں کی تھی۔ ان کے بھائی کا بھی یہی حال تھا۔ یہ دونوں حضورؐ کے کھلے موافق تھے۔ انھوں نے زینب کو زید کے پاس بھیج دیا۔ لیکن ان کی ازدواجی زندگی باہمی مفاہمت اور بناؤ نہ ہو پانے کے سبب سے ناہمواری ہوگئی اور طلاق ناگزیر بن گیا۔

طلاق کے بعد زینبؓ کا رجحان یہ ہوا کہ وہ زوجۂ رسولؐ بن کر رہیں۔ اِدھر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ آپؐ کے ہاتھوں ان کی ایسی شادی ہوگئی تھی جو خود ان کی پسند کے مطابق نہیں تھی۔ اس لحاظ سے آپؐ کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اب اس کی کم سے کم تلافی یہی ہوسکتی تھی کہ ان کی خواہش پوری کردیں..... اس طرح ان کو امہات المومنین میں شامل کرلیا گیا۔

صفیہ بنت حیئیؓ حیئی جو بنو نضیر کا ایک سردار یہود تھا۔ مسلمانوں اور یہودیوں

کے درمیان "جو خیبر" کی جنگ ہوئی تھی اس میں یہ اپنے والد، شوہر اور بھائی سے محروم ہو چکی تھیں۔ اور یہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدیوں کے ساتھ آ گئی تھیں۔ رسول اللہ سے آپ کے بعض صحابہؓ نے ان کا حال بیان کیا۔ چوں کہ آس ورحمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں وافر ملی ہوئی تھی، اس لئے آپؐ کا یہ مزاج تھا کہ کسی قوم کے معزز لوگوں کو جو ذلت میں پڑ گئے ہوں آپؐ سہارا دیتے تھے۔ آپؐ نے صفیہؓ کو بلایا اور فرمایا کہ دو میں سے ایک بات کو چن رکھو یا ترجیح دو۔

(۱) تم کو رہا کر دیا جائے اور خاندان کے بقیہ لوگوں کے پاس بھیج دیا جائے۔

(۲) یا تم اسلام قبول کر لو اور رسولؐ خدا کی زوجیت میں آ کر مسلمانوں کی ماں کی حیثیت قبول کر لو۔

جذبۂ مسرت اور جذبۂ شکر سے مغلوب ہو کر حضرت صفیہؓ زور سے بول اٹھیں:

[میں نے اللہ اور اس کے رسول کو پسند کر لیا]

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کر لی۔

ان تصریحات کی روشنی میں رسولؐ اللہ کی زندگی میں متعدد بیویوں کے متعلق یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ .... آپؐ نے اہم وجوہات کی بنا پر ہی شادیاں کیں۔ اور آپؐ کی شادیاں سرپرست کی حیثیت سے بطور پناہ یا بطورِ کفالت یا بطورِ تعزیت و تکریم تھیں۔

اس کے علاوہ متعدد شادیاں کرنا، اس زمانہ میں بلکہ بہت پہلے سے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا .... اس کے برعکس، اکثر اوقات متعدد شادیاں کرنا ایک قسم کی پاکیزہ قربانی تصور کیا جاتا تھا۔ آخر ادیانِ ثلاثہ کے جدِ امجد، نبیوں کے باپ، اللہ کے دوست سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی:

اپنی زندگی میں متعدد شادیاں کی تھیں، ان کے متعلق ہمارا خیال کیا ہوگا؟ اسی طرح بہت سے نبیوں کی زندگی میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔؟؟

حیاتِ رسولؐ میں لفظ "ازواج" سے جو بات پیدا ہوئی ہے، اس میں یہ تھوڑا سا وقت صرف کرنے کے بعد اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ موضوع ہے ان دو چیزوں کے درمیان ترجیح و انتخاب، جن کے متعلق وحیٔ الٰہی پوری شدّ و مد کے ساتھ نازل ہوئی۔

آیئے ہم اپنے موضوع کی ابتدا، آیت انتخاب ہی سے کریں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ	اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو
اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	اگر تم دنیا اور اس کی زینت
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ	چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے
وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○	دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کردوں
وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	اور اگر تم اللہ اور اسکے رسول اور دارِ
وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ	آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے
لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○	جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لئے
(سورہ احزاب آیت ۲۸-۲۹)	بڑا اجر مہیّا کر رکھا ہے۔

آخر وہ کون سی بات پیدا ہوگئی تھی کہ ان آیات پر مشتمل وحی نازل ہوئی جن میں احتجاج اور سرکشی کے رویّہ کا اظہار نظر آتا ہے۔۔۔۔؟

اس دن جو کچھ پیش آیا وہ بڑا ہی عجیب و غریب تھا۔

پورا جزیرۂ عرب اسلام کے آگے سرنگوں ہوچکا تھا اور مسلمانوں کو غنیمت کے مال

اللہ تعالیٰ دلوا تا رہا جن سے ان کی معیشت بلند ہوتی رہی۔ زکوٰۃ کی بوریاں جزیرہ کے شمال اور جنوب ہر طرف سے فصل کی کٹنی اور عشر و زکوٰۃ کی ادائیگی کے دنوں میں مدینہ آنے لگی تھیں، اونٹ، بھیڑ بکریاں اور مال و دولت کی ریل پیل ہونے لگی تھی اور اسی نسبت سے ہر گھر اور خاندان میں آسودگی اپنا راستہ بنا چکی تھی۔

البتہ ایک گھر ایسا تھا جو، اب بھی معاشی تنگی سے مقابلہ کر رہا تھا، اس گھر کو اس سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔

ایک ایک مہینہ اور دو مہینے گذر جاتے، جی ہاں! اور تین تین مہینے بھی اس حال میں گذر جاتے تھے کہ اس گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا، ہنڈیا نہیں چڑھتی تھی۔

یہ خاندان ــــــ رسول اللہ کا خاندان تھا .... !!!

آپ کا پورا خاندان .....

آپ کی ازواج مسجد کے پڑوس میں دُور دُور میں بنے ہوئے حجروں میں قیام پذیر تھیں۔ ہر ایک کا حجرہ الگ الگ تھا۔ مگر معاشی تنگی میں سب یکساں اور برابر تھیں۔

اتنا ہی نہیں! ..... بلکہ یہ تنگی کی ڈوری رسول کی بیٹی "فاطمہ زہرا" تک دراز تھی جو کچھ دوری پر اپنے شوہرِ نامدار حضرت علیؓ کے ساتھ قیام پذیر تھیں ..... چنانچہ جب کبھی اپنے والد رسول اللہ کے گھر جاتیں تو آپ کے پاس لوگوں کے جو کچھ عطیئے آتے تھے، ان میں سے وہ اپنے لئے بھی کچھ طلب کرتیں۔ اس کا جواب آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سنتیں:۔

"یہ میں تمہیں نہیں دوں گا۔ میں نے اسے مسلمان نفقرار کے لئے رکھ چھوڑا ہے .... !!

ایک بار ایسا ہوا کہ جب آپؐ نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں تو آپؐ نے ان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور فرمایا:

"کیا تم کو اس سے اچھی چیز نہ بتا دوں؟....

سُبْحَانَ اللہ کہو ۳۳ بار

اَلْحَمْدُلِلّٰہ کہو ۳۳ بار

اَللّٰہُ اَکْبَر کہو ۳۴ بار

آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ آپؐ کی اور اور آپؐ کے اہلِ بیت کی دنیا کے تعلق سے کیا حیثیت ہے اور ان کے تعلق سے دنیا کی کیا حیثیت ہے.... آپؐ آگاہ تھے کہ یہ زندگی وجود میں آئی ہے اس غرض سے کہ دنیا کو کچھ دیں، اس غرض سے نہیں کہ اس سے کچھ لیں.... اور اسی سبب سے آپؐ نے اپنے اہل و عیال کی زندگی کو بھی اس نہج پر ڈالا کہ زندگی کو محض بطور کفاف سمجھا ــــــ بلکہ کفاف بھی بہت ہے۔!!

جب مسلمانوں کے لئے دنیا کا خزانہ کھل گیا اور ان کے پاس غذا، لباس اور راحت کی نعمتوں کا ڈھیر لگ گیا، تو آپؐ نے اپنی ازواج کو موقع عنایت فرمایا کہ ان نعمتوں میں سے کچھ طلب کریں.... مگر انھوں نے طلب نہیں کی بلکہ ان کے اندر اتنی چیزوں کے لئے بھی رغبت موجود نہیں تھی جتنی عادتاً اکثر لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ البتہ.... ان میں سے ایک نے اللہ کے رسولؐ سے اس معاملے میں کچھ کہا۔

رسول اللہؐ ان کی بشری طبیعتوں کا اندازہ فرماتے رہتے تھے۔ اور آپؐ ان کی پاکیزہ خواہشات کی معمولی چیزوں کو پورا کرنے میں بخیل بھی نہ تھے.... لیکن ــــــ پھر مثالی

رہنمائی کب ہوتی! ..... ان کو امہات المومنین کی قدر و منزلت ملنے کے سبب جو حقوق ان پر عائد ہوتے تھے، وہ کیسے ادا ہوتے؟

قیادت کا تقاضا یہاں صرف رسولؐ سے ہی نہیں ہے بلکہ نسبت اور قرابت کے لحاظ سے جن لوگوں کا بھی رسولؐ سے تعلق ہے ان سب سے قیادت کا ایک تقاضا ہونا تھا، اور ان بہترین نمونۂ زندگی کی امید کی جاتی ہے۔

کیا آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں فرمایا تھا جب فتح کے دن آپؐ سے کعبہ کی کنجیاں طلب کی تھیں کہ:

"میں تم کو وہ بھلائی عطا کرتا ہوں جس کو لوگ تم سے حاصل کریں گے، وہ نہیں جس کو تم لوگ خود حاصل کر کے رکھو گے"

اور کیا آپؐ نے اپنے اہل و عیال کے لئے یہ قاعدہ نہیں بنا رکھا کہ جب لوگوں کے فاقہ کی نوبت آئے تو پہلے وہ خود فاقہ کریں ..... اور جب پیٹ بھرنے کا موقع میسّر آئے تو سب سے آخر میں اپنا پیٹ بھریں ..... ؟؟! ..... ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ لوگوں کے پاس بہت کچھ ہو جائے خواہ ان کو اپنا پیٹ آخر میں بھرنا پڑے!!

ہاں! اور یہ تو وہی شخص ہے جو خود بھی کھجور اور پانی پر گذارا کرتا تھا اور اس کے خاندان کے لوگ بھی بس اسی کھجور پر جیتے ..... جب کہ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو اکثر گھروں سے آتی تھی اور گوشت کے جوش مارنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

یہ وہی شخص ہے جو چٹائی پر سوتا تھا اور چٹائی کے نشانات آپؐ کے جسمِ مبارک پر نقش ہو کر رہ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا ہوا کہ عمرؓ ابن خطاب کی نظر اس شخص

کے جسم کے نشانات پر پڑی تو وہ بے ساختہ رونے لگے اور اجازت طلب کی اس ذاتِ عظیم کے لئے ایک نرم بستر بنادیں تو ان کو جواب یہ ملا تھا:

"اے عمر، یہ کارِ نبوت ہے، شہنشاہی نہیں ہے!!"

یاد رکھو، یہ یومِ انتخاب و ترجیح، ...... اور رسولؐ کا طریقہ جب کہ جزیرہ عرب پورا کا پورا اللہ کی مرضی سے آپؐ کے لئے اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کے لئے فتح ہو چکا تھا اور اس خطہ کے تمام اچھے کام اور تمام معاملات آپ کے حکم کے ماتحت ہو چکے تھے۔ ...... ہم یہ کہیں گے کہ آپؐ کا یہ طریقہ آپؐ کی نبوت اور رسالت کی صداقت کی بہترین دلیل ہے ـــــ ہر اس شخص کے لئے جو اس کی دلیل چاہے۔

اگر اللہ کی رضا ان تمام مساعی کا مقصد نہیں تھا تو آخر ـــــ ان سب کی غرض کیا تھی؟ کافی ہوتا اگر آپؐ اپنی عمرِ مبارک عبادات اور قربانیوں میں صرف کرتے! پھر وہ کیا چیز پیشِ نظر تھی کہ جہاد کی جانفشانی اور مسلسل بیس سال تک بت پرستی کی پیدا کی ہوئی دہکتی آگ کی چنگاریوں اور شعلوں کا خوف آپؐ کی ذات سے ٹکراتا رہا اور آپؐ گوارا کرتے رہے۔؟

کیا یہ سب کچھ برداشت کر کے آپؐ پلے اور ڈٹے رہے، اپنی شخصی بڑائی کے لئے؟ یا دنیوی زندگی سے بھرمنہ فائدہ اٹھانے کے لئے؟ دنیا نے دیکھا کہ جب آپؐ سید الجزیرتین گئے جب بھی شخصی بڑائی کے اظہار سے دُور بھاگتے رہے۔

بلکہ آپؐ کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد تھی کہ ..... ہر طرح کے امتیازات کو آپؐ نے مٹا دیئے .... اور .. .. اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ لوگ آپؐ کے احترام میں کھڑے

ہوں جب آپؐ تشریف لائیں .... اور اس بات کا موقع نہیں دیا کہ کوئی بدّو فقیر محتاج آپؐ کا دامن سمیٹ کر اپنے ہاتھوں میں لے لے اور کہے :

"مجھے یہ مال دو جو تمہارے پاس ہے۔ یہ نہ تمہارا ہے ، نہ تمہارے باپ کا ہے"......... !!!

پھر آپؐ کا حیاتِ دنیا سے فائدہ اٹھانا بھی تو کہیں نظر نہیں آتا..... جب کہ ہر چیز کے ثمرات آپؐ ہی کے پاس سمٹے چلے آرہے تھے ......؟

آپؐ نے اپنا طریقہ نہیں بدلا۔ اپنے طریقے پر قائم رہے ..... ایک دن شکم سیر ہوتے تو کئی کئی دن فاقے کرتے .... موٹی کھردری چٹائیوں پر سوتے ..... آپؐ کے جسم کا لباس کیا تھا؟ بس وہی آپؐ کی ایک چادر تھی۔ آپؐ کے پاس کھانے اور کپڑے تحفے میں آتے تھے اور خود آپؐ کے اہل بیت میں بہت سے لوگ سخت ضرور تمند بھی ہوتے تھے ، تاہم آپؐ ایثار کرتے اور اپنے کسی غریب صحابی کو ترجیح دیتے تھے ..... اس طرح مہینہ دو مہینے گذر جاتے جب آپؐ کے گھر میں ہنڈیا نہیں چڑھتی تھی اور آگ نہیں سلگتی تھی !!

نہ کوئی بڑائی کا اظہار تھا جس کے لئے آپؐ نے یہ سب کچھ برداشت کیا ، نہ خوشحالی تھی ، نہ سیادت و سرداری تھی جس کی غرض سے آپؐ نے اتنا سب کیا ، تو پھر وہ کون سا مقصد ہو سکتا تھا جس کے لئے اتنی تمام مشکلات کا بوجھ اٹھاتے رہے اور اسلام کے راستے میں حائل خوف وخطر کے حالات کو لئے پھرتے رہے ؟

کوئی مقصد نہیں تھا سوا اس کے کہ اسلام اللہ کا کلمہ تھا ——— اور آپؐ اللہ کے رسول تھے .....

•••

اور یہی حال تھا جس میں آپؐ نے اپنی ازواج کو بھی مبتلا کر رکھا ـــــــ ہم نے دیکھا کہ جب آپؐ نے محسوس فرمایا کہ آپؐ کی بیویاں دنیا کی طرف نکلنا چاہتی ہیں، اس کی نعمتوں پر ٹوٹنا چاہتی ہیں، اس کی چمک دمک اور حسن پر ریجھنا چاہتی ہیں تو آپؐ نے غصہ ظاہر کیا اور وحی بھی نازل ہوتی ہے تو آپؐ ہی کی تائید میں اور ازواج کے رویہ کی تردید میں :

یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِیْمًا ۝	اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں، اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔
(سورہ احزاب آیت ۲۸-۲۹)	

ہاں! بیتِ نبوت میں دنیا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی اور خدا کی قسم، وہ ان پر جبر بھی کرنا پسند نہیں کرتے تھے ..... لہٰذا بات صاف تھی کہ جس کو دنیا اور اس کا حسن پسند ہو، وہ بیتِ نبوت سے کوچ کر جائے اور قیادت کی منزل کو خیرباد کہہ دے ..... اس کے

بعد دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح دنیا کی لذتیں جتنی حاصل کرے۔

ورنہ جس کو اللہ اور اس کا رسول اور آخرت کا گھر پیارا ہے اس کے لئے توجہ ہے بس وہی ہے۔ ہاں! اللہ کی طرف بڑا اجر ضرور ملنے والا ہے مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ دنیا کو پسِ پُشت ڈال دے۔ اور خوشحالی و راحت کا سامان موجود ہونے کے باوجود تنگدستی اور عُسرت کی زندگی کو نبوت، وحی اور ایمان و یقین کے گھر میں قبول کرلے .... !!

رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکے بعد دیگرے اپنی تمام ازواج کے پاس اللہ تعالیٰ کے یہ کلمات تلاوت کرتے ہوئے آئے اور اللہ کے حکم کو ان تک پہونچا کے موقع دیا کہ وہ خود کس بات کو اختیار کرلیں۔

آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے یہ سلسلہ شروع کیا، پھر بقیہ ازواج کے پاس پہونچے... ... مگر ان میں ایک بھی ایسی نہ تھیں جنھوں نے ان آیتوں کو سن کر چیخ مار کر یہ نہ کہا ہو کہ :

"میں تو اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہی اختیار کرتی ہوں۔"

اور کیا رسولؐ ان سے اس کے سوا کسی اور رویّہ کے منتظر تھے ؟

اور کیا ایک ہاتھ میں اللہ و رسولؐ کی رضامندی کو رکھا جاتا ..... اور دوسرے ہاتھ میں دنیا کی شان و شوکت کو، اس کے بعد انتخاب اور اختیار کرنے کا بھی کوئی سوال ہو سکتا تھا ؟ ...... وہ بھی کس کے نزدیک ؟ رسولؐ کی ازواج، اُمّہات المومنین کے نزدیک؟!

خدائے پاک یہ چاہتا تھا کہ اس یومِ اختیار اور ان فیصلہ کن واقعات کے ذریعہ اپنی مخلوق کے پاکیزہ بندوں اور رسولوں کی بلند و پاکیزہ زندگیوں کے جوہر کو مزید نکھارے........

ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی نکھار کر سامنے لانا چاہتا تھا کہ لوگ جس شئے کی بنا پر آپس میں لڑ پڑتے ہیں اس کا تعلق اس دنیا کی حقیر حیثیت، اس کی رعنائیوں اور جھوٹی بڑائیوں سے ہے۔

بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دنیا میں ہر زمانہ میں بسنے والے انسانوں کو ایک قیمتی سبق ملے تاکہ راہِ ہدایت کو دیکھ لیں اور ——— اللہ کی دنیا، اور لوگوں کی دنیا ——— کے درمیان ایک انتخاب کرلیں۔

یوم وداع

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔

پس تم اپنے رب کی حمد کی تسبیح میں لگ جاؤ
اور استغفار کرتے رہو یقیناً وہ توبہ قبول
کرنے والا ہے

(سورۃ نصر : ۳)

○ اللہ تعالیٰ نے اس ذات پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور اس کے قلب و نگاہ کو طمانیت میسر آ گئی جب اس نے دیکھ لیا کہ شرک اور بت پرستی جزیرۂ عرب سے خس و خاشاک کے مانند صاف ہو چکی ہے .... اس نے اپنے ہاتھ سے اللہ کے گھر کو طواف اور اعتکاف، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لئے پاک کر دیا۔ اب دوبارہ کوئی مشرک کبھی اللہ کے گھر کا طواف نہیں کرے گا ......

اور اب مناۃ اور عزّیٰ کو، نہ ہُبل اور لات کو اور نہ دوسرے بتوں کو جن کے آگے لوگ اور ان کے آباء و اجداد ایک زمانہ سے سجدہ ریز ہوتے آئے تھے، یہاں کوئی جگہ ملے گی۔

دینِ ابراہیمؑ اب اپنے وطن میں واپس آ گیا اور اللہ کی حمد اور تسبیح و تقدیس کرنے لگا۔ اللہ کا کلمہ زمین کے تمام شہنشاہوں تک ان سفیروں کے ذریعے پہونچ گیا جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک مہم پر روانہ فرمایا تھا۔

تیئسویں (۲۳) سال کے سرے پر۔ کہ جس طویل مدت کو آپؐ اور آپؐ کے قدسی صفت صحابہؓ نے حق کی حمایت اور دشمنوں سے مقابلے میں گذار دیا۔ وہ دن آیا کہ جب فتح و کامرانی کی جماعت، اللہ کا پرچم اٹھائے اکٹھا ہو گئی۔ ہاں! وہی پرچم جس نے سرزمین عرب کو بزرگی و بڑائی، آب و تاب اور نور ہدایت سے معمور کیا تھا۔

پچھلے تمام برسوں میں یہ دن ...... کتنا بارونق، اور یہ زندگی ..... کتنی پاکیزہ تھی!!

ذیقعدہ ۱۰ھ کے اواخر میں بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے آپؐ کی سواری تیار ہو گئی۔ اور تمام مسلمانوں نے بھی آپؐ کے ساتھ چلنے کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔

جب عرفات میں اترے تو آپؐ پر اس آیتِ کریمہ کی وحی کا نزول ہوا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج ہم نے تمہارے لئے دین
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ	مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ	کری اور تمہارے لئے بطورِ دین، اسلام
دِیْنًا ۰ (سورۃ مائدہ ۳۵)	سے راضی ہو گیا۔

دین مکمل ہو گیا، نعمت پوری ہو گئی۔ اور اسلام مقامِ قیادت پر فائز ہو گیا ......

پھر تو مشن پورا ہو گیا۔ اور سفر اپنی انتہا سے ہمکنار ہو گیا۔

دارِ ارقم "سے چل کر" مدینۃ الرسول "تک بلکہ پوری دنیائے انسانیت کو آپؐ کی سیرت پاک اور طریقِ زندگی نے نور سے جگمگا دیا۔

محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ نے مبارک مشعل روشن کی ...... اور اللہ نے طے کر دیا کہ اب یہ روشنی کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

کارِ رسالت انجام پا گیا، امانت پہونچا دی گئی اور اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا۔

کیا تم نے دیکھا؟ سواری کی واپسی کا وقت آ گیا ہے..... اور مسافر کو بہرحال گھر واپس ہونا ہے...... ہاں! یہ لوٹنے اور کوچ کرنے کا وقت ہے۔

منیٰ میں جب شعائرِ حج مکمل ہو گئے اور ایامِ تشریق ختم ہونے کو آئے تو ان آیات کی وحی نازل ہوئی:-

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح ہو گئی
وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ	اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ اللہ کے دین میں

فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿ۙ﴾ جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ تو اپنے رب کی تعریف بیان کرو

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ اور اس سے معافی طلب کرو، بلا

(سورہ نصر) شبہ وہ توبہ قبول کرنیوالا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت ____ اس نئی وحی کی تلاوت اپنے اصحاب کے سامنے فرمائی، تو ان کی طمانیت اور مسرت دوبالا ہوگئی کیوں کہ اس میں اللہ کی مدد اور فتح دوام کا ذکر تھا۔

لیکن ابوبکرؓ، عمرؓ اور عباسؓ تھے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو تھمتے نہ تھے، کیوں کہ انکو اس میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مدتِ عمر پوری ہوجانے اور آپؐ کے سفرِ آخرت قریب آنے کا اشارہ معلوم ہوا ...... خود رسولِ پاکؐ نے ان کے اس فہم کی تصدیق کردی اور بتلا دیا کہ یہ آیات دراصل آپؐ کے رخصت ہونے کی خبر لے کر آئی ہیں۔

...... اس طرح وحی نے اشارے کئے اور وفاتِ رسولؐ کا وقت قریب آلگنے کی خبر دی۔

اور جب تیرے رب کی پاکیزہ بات پوری ہوگئی، اس نے دین کو فتحیاب کردیا، اس کے سامنے آفاق کے دروازے کھل گئے اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ اس دین کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں، اس میں فوج در فوج داخل ہورہے ہیں ____ جبکہ وہ اب تک اس دین کو رسوا کررہے تھے، اس سے کترا رہے تھے ____ تو اب تم اپنے ربّ اعلیٰ سے ملاقات

کے لئے تیار ہو جاؤ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہم پوری ہو گئی تو اب انسانوں کی دنیا میں انکے لئے جگہ باقی نہیں رہی..... اب ان کو مزید مہلت نہیں ملے گی ـــــ چند سال کا موقع بھی نہیں ـــــ کہ وہ فتحیابی کے جشن منائیں اور اپنی خوشحالی اور فارغ البالی کے اس دور میں کچھ دن گذار لیں۔

اس سُرعتِ انتہا کا مفہوم کیا تھا؟..... یہ اصلاً رب العالمین کے رسولؐ کا زبردست اعزاز تھا۔ وہ یہ تھا کہ اس طرح یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ اللہ کے نزدیک رسولؐ کا مقام کیا ہے؟ آپؐ اس کے رسولؐ مقرر ہوئے شخص کی حیثیت سے دنیائے بشریت کے پاس آئے تھے... اسی نے آپؐ کو پیدا کر کے خاص اسی مہم کے لئے منتخب کر لیا تھا، کسی دوسری مہم کے لئے نہیں.... اسکی جانب سے بات پہونچا دینے کی مہم، اس کی طرف بلانے کی مہم اور اس کے پرچم حق کو زمین میں گاڑ دینے کی مہم۔

جب آپؐ کا یہ نصب العین پورا ہو گیا۔ تو آپؐ فوراً اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف چلے گئے۔ کیوں کہ وہی آپؐ کا حقیقی وطن اور دائمی جائے قیام ہے۔

لیکن اس طرح کیوں کیا گیا کہ وحی کے ذریعہ آپ کو سفر کے قریب ہونے کی آگاہی دی گئی جس کے ساتھ یہ تعلیم بھی دی گئی کہ آپؐ تسبیح اور استغفار کریں....؟

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	تو اپنے رب کی تعریف بیان کرو
وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ	اور اس سے معافی طلب کرو
كَانَ تَوَّابًا	بلاشبہ وہ توبہ قبول کرنیوالا ہے

یہ دراصل ایک نئی دلیل تھی، بلکہ تمام دلیلوں سے بڑی دلیل، اس بات کی کہ محمد.... عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام۔ اللہ کے رسول ہیں، اسی سے ہدایت پاتے ہیں اور اس کے حکم سے ہی اس کی طرف دعوت دیتے ہیں......

اگر آپؐ اپنی شخصی حیثیت سے کام کرتے، اور آپؐ کے ذاتی تیر کمان آپؐ کی مدافعت کے لئے ہوتے تو ان آلات کو فتحیابی کا یہ شرف کب حاصل ہوتا؟ اور آپؐ کو یہ محسوس بھی کب ہوتا کہ آپؐ کا وقت قریب آچکا ہے کہ آپؐ اپنے احساس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے جس سے آپ کے وصال کا پتہ چلتا، یہ انداز ہرگز نہ ہوتا........ توبہ و استغفار کی تلقین کا انداز۔

لیکن چوں کہ آپؐ خدا کے سچے رسولؐ ہیں، اور قرآن خدا کی سچی کتاب ہے، اس لئے آپؐ کی رحلت کی خبر اس حسین اور بے مثل انداز میں دی گئی۔

اس مقام پر اپنے رب کی طرف واپسی کے سفر میں آپؐ کے کرنے کا کام کچھ نہ تھا سوا اس کے کہ آپؐ زیادہ سے زیادہ تسبیح کرتے رہیں۔ اللہ کی تعریف اور اس کی پاکی کا ذکر زبان پر جاری رکھیں۔ اور اگرچہ آپؐ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو، پھر بھی آپؐ برابر گناہوں کے لئے اس سے معافی طلب کرتے رہیں ... !! کیوں کہ استغفار سے بے نیازی کا مطلب ہے اپنی اطاعت اور کمال پر اترانا۔ جبکہ استغفار کا لہجہ اختیار کرنے کا مطلب ہوتا ہے اللہ کی نعمت کا اقرار اور اس کی نعمتوں کے شکریہ کی ادائیگی سے عاجز ہونے کا اقرار...... اور اس اقرار میں اللہ کی سچی بندگی کی علامت پائی جاتی ہے، ساتھ ہی اللہ کے نزدیک مقام کی بلندی کی بھی علامت ہے....... !!

یہی وجہ ہے کہ ہم آپؐ کو دیکھتے ہیں کہ آپؐ اپنے رب کی عبادت میں اپنے آپؐ کو گھلاتے

جارہے ہیں۔ اور اللہ کی آیات کا نزول ہوتا ہے تو آپؐ کے زاہدانہ افعال اور تعبدی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کے نازل ہونے کے بعد اتنا سخت مجاہدہ شروع کر دیا تھا کہ آپؐ کے قدمِ مبارک سوج جایا کرتے تھے، آپؐ کا جسم اطہر سوکھ گیا، آپؐ کی مسکراہٹ بہت کم ہوگئی اور آہ و بکا بڑھ گئی......

"یومِ وداع" کا یہ بہترین تحفہ تھا جو آپ کی صبح کی گریہ وزاریوں میں ہمیں نظر آتا ہے اور آج بھی، بلکہ جب اکٹھا ہونے کے دن آپؐ کی گواہی ہوگی، اس دن تک ہم آپؐ کی یہ کیفیت دیکھتے اور سنتے رہیں گے۔

منیٰ کی اس وسیع وعریض سرزمین میں ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان کھڑے تھے.... وہ اپنے مکرم و باشرف رسولؐ کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ اور آپؐ تیار تھے کہ ان لوگوں کو اپنے روشن کلمات میں سے وہ بات سنائیں جو ان کے لئے نصیحت کا درس ہو۔

اس وقت اور اس جگہ خوشی اور امید و اعتماد کا دَور دورہ تھا۔ لوگوں کے اندر زندگی اور تگ و دو کا جوش موجزن تھا۔

ان کو واقفیت نہیں تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رخصت ہونے کی خبر دے دی گئی ہے۔ ایسے ماحول میں آپؐ نے سورہ "النصر" کی تلاوت فرمائی۔ انھوں نے سنا بھی

...... لیکن وہ بات کی اس تہہ کو نہ پہونچ سکے جہاں حضرت ابوبکر و عمر اور عباس رضی اللہ عنہم کے ذہن کی رسائی ہو گئی ـــــ اللہ ان سے اور تمام اصحاب رسول سے راضی ہو۔

ان کو کوئی خبر نہ تھی۔ وہ تو ایک عظیم جشن میں مصروف تھے۔ وہ مناسک حج ادا ہو جانے کی خوشیوں میں جھوم رہے تھے۔ ساتھ ہی اللہ کی مدد اور فضل کی جو نعمت ملی تھی اس کے احساس میں سرشار تھے۔ یہاں ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان کیا تھے گویا پورا جزیرۂ عرب جمع تھا اور تمام قبیلوں اور باشندوں کا مجمع تھا۔

ہاں! ـــــ اور یہاں اب شرک موجود نہ تھا اور مشرکین بھی ناپید تھے۔ آج تمام قبیلوں اور ہر گھر میں اسلام ہی نظر آرہا تھا..... !!!

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلمات پیش فرمانے والے ہیں۔ صحابہؓ آپؐ کی بات کو دہرا کر لوگوں تک پہونچانے کے لئے آپؐ کے قریب کھڑے ہو چکے ہیں تاکہ آپؐ کا فرمان تمام مسلمانوں کے کانوں تک پہونچ جائے.......

اس خطاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل سے تیار نہیں کیا تھا، اور نہ بنا بجا کر لکھ رکھا تھا۔ بلکہ آپؐ رخصتی خطبہ کے لئے اس طرح حاضر ہوئے تھے کہ حساب دینے کی تیاری جیسی شکل ظاہر ہو رہی تھی ـــــ کیسی رخصتی ؟! بلکہ لگتا تھا کہ آپؐ اس کے لئے تیار بھی نہ تھے کہ آج خطبہ کے لئے کھڑے ہوں۔ کیوں کہ آپؐ کے پاس وہ چیز آگئی تھی ـــــ یعنی اپنے رب اعلیٰ سے ملاقات کی تیاری، جس میں آپؐ محو ہو گئے تھے۔

آپؐ ہمیشہ جس کشادہ دلی کے ساتھ ایثار سے کام لیتے اور تکلف اور بڑا پن کے انداز سے دور رہتے، اسی طرح آج بھی اپنے اصحاب کے درمیان کھڑے یاد دہانی اور نصیحت فرمانے لگے،

آپؐ نے باتیں کہیں اور جامع الفاظ میں۔ جو کافی وشافی تھیں۔

گردنیں اٹھنے لگیں، قلب ودماغ متوجہ ہوگئے اور آنکھیں ٹِک گئیں ..... ایک پُرسکوت فضا تھی جس کو چیرتی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنائی دینے لگی :

"اے لوگو ! میری بات سن لو ! کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ آئندہ کیا ہوگا ؟ شاید اگلے سال تم سے میری ملاقات اس جگہ پر ہو سکے" .... !!

یہ ایک ایسی بات تھی جس کی لوگوں کو توقع نہ تھی۔ اور بظاہر یہ لوگوں کو گوارا بھی نہ تھی... خوشی سے معمور ماحول پر اچانک ایک افتاد آپڑی جو ساری خوشیوں کو اچک لے گئی......

کیسی افتاد ؟ ؟ ــــ "شاید اس سال کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہوسکے"۔ اے اللہ کے رسولؐ ! یہ کونسا ڈرانے والا آج ہمیں گرانبار کیے دے رہا ہے ؟ ..... آپؐ نے تو ایسا کبھی نہیں کیا، آپؐ ہمیشہ ہمارے ساتھ پاکباز اور رحیم وشفیق رہے .... !!

ان کی غم بھری سسکیوں کی آواز بلند بھی نہیں ہوسکتی تھی کیوں کہ قرآن کریم پہلے ہی انکو تعلیم دے چکا تھا کہ لوگ اپنی آوازیں رسولؐ کی آواز سے بلند نہ کریں۔ یہاں پر بولنے کا ہر ارادہ غم واندوہ کی وجہ سے چشمِ پُرنم کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ کیوں کہ یہی ایک قوت تھی جو آواز کے بغیر آہ وفغاں کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس طرح عظیم فیض رسانی کے موقع پر اکٹھا اس مجمع نے آنسو کا دریا بہا دیا.... !!

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آگے اپنی بات یوں فرماتے ہیں :

"اے لوگو ! بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال ایکدوسرے

پر حرام ہیں ، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو۔ ہاں!
اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کا یہ دن حرمت کا دن
ہے۔..... اور جس طرح یہ مہینہ حرمت کا مہینہ ہے......
"وہ وقت دُور نہیں جب تم اپنے رب سے ملنے والے
ہو ، اس وقت وہ تم سے تمہارے اعمال کا حساب
لے گا۔!!

لو! یہ بات میں نے تم تک پہونچا دی۔
ہاں! اور جس کے پاس کوئی امانت ہو ، وہ امانت رکھنے
والے شخص کو اس کا مال لوٹا دے......"

اس طرح الوداعی خطبہ میں مختصر اور جامع انداز میں آپؐ نے زیادہ تر حقوق کی اہمیت وتقدیس کو بیان فرمایا : جینے کا حق .... جدوجہد کا حق .... اس کے بعد خون کی حفاظت، اور مالوں کی حفاظت۔ ان میں سے شرعی طور پر مقرر سے زیادہ نہیں لیا جاسکتا۔ پھر اسی ایک ہی سلسلے میں آپؐ نے حسب عادتِ شریفہ، انسانی عمل اور خدائی نگراں قوت کے درمیان ربط بیان فرمایا۔ تاکہ لوگ اپنے رب کو نگاہوں کے سامنے رکھیں اور اس سے ڈرتے ہوئے اس کی نصیحتوں اور دعوت کا لحاظ رکھیں۔........:

"بہت جلد تم اپنے رب سے ملنے والے ہو ، اسوقت
وہ تمہارے اعمال کے بارے میں تم سے سوال کریگا"

پھر آپؐ نے سُود کی زوردار مذمّت فرمائی ...... اور تمام جھگڑوں کی مذمّت فرمائی کیوں کہ دونوں ـــــ سود اور جھگڑے ـــــ جینے کے حق اور مال کے حق پر زیادتی کے مصداق ہیں۔

آپ علیہ السلام نے اپنے خطبہ میں نئے انداز میں فرمایا :

"ہر سود ساقط کر دیا گیا ، اب صرف اصل مال پر تمہارا حق ہے ، نہ تم ظلم کرو ، نہ تم پر ظلم کیا جائے .... اللہ تعالےٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اب کوئی سود باقی نہیں رہے گا ..... اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سُود ساقط کرتا ہوں ، اسی طرح ہر خون جو جاہلیت میں ہوا تھا ، اب ساقط کر دیا گیا۔ اور سب سے پہلے میں اپنے بھتیجے ربیعہ بن الحارث ابن عبدالمطلب کا خون ساقط کرتا ہوں "

اس طرح پیش قدمی آپؐ نے اپنے ہی گھر والوں سے فرمائی ..... چنانچہ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ کا سُود جو اسلام کے حرام کرنے سے قبل کا واجب الادا تھا ، سب سے پہلے آپؐ نے اس کو ساقط اور باطل فرمایا۔ اسی طرح اپنے چچازاد بھائی ـــــ ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون سب سے پہلے ساقط کر دیا جو عام عادت کے مطابق جھگڑا اور انتقام کا مسئلہ تھا۔ ......

پھر وسیع و عریض افق پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت عجیب شان میں نظر آ رہی تھی جو آپؐ کے وطن اور آپؐ کی سرزمین سے شرک کی جڑ کٹ جانے کی

صورت میں ظاہر ہوئی تھی۔ لیکن آپؐ اس امر سے واقف تھے کہ ہر عظیم فتح کے کچھ عرصہ بعد نئی نئی چیزیں جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ جب شیطان معرکۂ بت پرستی ہار چکا ہے تو اب لوگوں کو گمراہ کرنے اور دھوکہ میں ڈالنے کی طرف وہ اپنی توجہ مبذول کرے گا۔ اور گناہوں کے کام اور نفسانیت کو آلۂ کار بنائے گا۔

اس پہلو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ـــــ جو ہمیشہ اپنے اصحابؓ کو گناہوں میں پڑنے کے خطرہ سے ہوشیار کرتے رہتے تھے ـــــ ضروری تھا کہ اس الوداعی دن بھی ایک بار پھر یاددہانی کرادیں اور اس کے فریب میں آکر گناہوں اور نفسانیت میں پڑنے سے ہوشیار کردیں خواہ یہ صغیرہ ہی ہوں۔ فرمایا:

"اے لوگو!

بلا شبہ آج شیطان مایوس ہوچکا ہے کہ اب تمہاری اس سرزمین میں اسکی بندگی نہیں ہو گی۔ لیکن وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ وہ تم کو ایسے اعمال میں مبتلا کر دے جنکو تم حقیر و معمولی سمجھتے ہو۔ اس طرح وہ اپنی نہیں تو کسی اور کی تابعداری میں تم کو لگا دے گا۔ اس لئے اپنے دین کے معاملے میں تم ہوشیار رہو۔"

وہ ایک زمانہ تھا جس میں لوگ زندگی گذار رہے تھے ...... اور زمانہ میں ماہ و سال اور دن ہوتے ہیں ...... جب اسلام نے بعض مہینوں کو متعین فرائض کی ادائیگی کے لئے

پیمانہ اور وقت کے طور پر مقرر کیا..... مثلاً روزہ کے لئے رمضان کو ____ اور حج کے لئے ذی الحجہ کو ____ اور ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب کو حرمت کے مہینے قرار دیا جس میں جنگ و قتال جائز نہیں ہے، تو ضروری تھا کہ اس دن "نسی" کے طریقے کو باطل کرنے پر بھی توجہ مرتکز کریں۔

"نسی" زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں ایک لایعنی کام تھا جو مہینوں کی زمانی ترتیب کے لئے وہ کرتے تھے،...... مثلاً جب "محرم" آتا اور لوگ جنگ کرنا چاہتے تو اس "محرم" کو "صفر" قرار دے لیتے تھے...... اس طرح وہ اپنی جنتری میں کبیسہ سے کام لیتے، اور وہ سال ساڑھے بارہ مہینوں کا بنا لیتے۔ گویا قمری مہینوں کو وہ بڑھا لیتے تھے۔ اس کا اثر حج پر پڑتا تھا کہ غیر مقرر وقت میں حج کے دن آجاتے تھے۔ بلکہ سال بسال حج گھوم گھوم کر ہر ماہ میں پڑنے لگا تھا۔

وقت آگیا تھا کہ اللہ کے رسولؐ مقررہ وقتوں کو قرار عطا فرما دیں۔ چنانچہ فرمایا:

"لوگو!

"نسی۔ کفر میں ایک اضافہ ہے، یہ کفر میں پڑے لوگوں کی گمراہی میں مبتلا ہونے کا ایک ذریعہ ہے کہ وہ کسی ماہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی کو حرام بنا لیتے ہیں، تا کہ اللہ کی مقرر کردہ گنتی سے موافقت پیدا کرلیں، چنانچہ اللہ نے جس چیز کو حرام ٹھیرایا ہے، اس کو حلال کر لیتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے حلال کیا ہے

اس کو حرام کر لیتے ہیں۔

"اب زمانہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا ہے جس پر اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرتے وقت مقرر کیا تھا۔ اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ ہی ہے۔ ان میں چار مہینے حرمت کے ہیں"

اس کے بعد آپؐ اپنی بھلائیاں اور رحمتیں بکھیرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عورتوں کے متعلق تم کو نصیحت کی جاتی ہے۔ اس نصیحت کو تم قبول کرلو، وہ تمہاری معاون ہیں لیکن محتاج ہیں....اور تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر اپنے ذمّہ لیا ہے۔ اور ان کو اللہ کے فیصلہ کن کلمات کے ذریعہ تم نے حلال کیا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وقت سکڑ رہا ہے جبکہ نصیحتوں کا میدان نہایت کشادہ اور طویل تھا۔ اس لئے آپؐ نے اپنی نصیحتوں کو اس ایک جملہ میں سمیٹ دیا:

"ہم نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس کو مضبوط تھامے رہے تو ہرگز کبھی گمراہ نہ ہو گے یعنی اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت........"

ہاں! قرآن اور سنت!........ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس ۲۳ سال تک اس زمین پر آسمانی رسول کی حیثیت سے زندگی گذاری اس کا ماحصل یہی تھا۔ ان دونوں

کے اندر پوری ہدایت، عافیت اور روشنی تمام کی تمام سمو دی گئی۔

توقع تو یہی ہو رہی تھی کہ آپ کا یہ فقرہ آخری خوشبو ہو گا...... مگر مسلمانوں کے درمیان انسانی تعلقات اور ان میں سے ہر فرد پہ عائد ہونے والے حقوق کا موضوع دوبارہ سامنے آتا ہے اور اس پراز سرِ نو روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ اختتامی کلمہ کے لئے بھی آپ اسی کو مخصوص فرماتے ہیں۔:

• تم خوب اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور یہ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ چنانچہ کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی کوئی چیز لے جب تک وہ خود اس کو اپنی خوش دلی سے نہ عطا کرے۔ اس لئے تم لوگ اس معاملہ میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔"

پھر آپ نے اس بے پناہ مجمع کی طرف چمکتی آنکھیں ڈالیں، اور پکارا:

"اے اللہ! کیا ہم نے پہونچا دیا؟؟"

اونچی آواز میں ایک نہایت سہل جواب گونج اٹھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار زبانوں سے نکلی ہوئی آواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دے رہی تھی:

• اے اللہ! ہاں!"........

اس مقدس دن کو چودہ سو سال گذر گئے،

چودہ سو سال اور بھی گذریں گے۔

بلکہ مزید ہزاروں سال بیت جائیں گے۔ اللہ نے اس زمین کو ہمیشہ باقی رہنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی جو مدت باقی رہ گئی ہے ـــــــ اس مدت میں ـــــــ انسانی ہدایت اور انسانی ضمیر دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سوالیہ صدا، بازگشت کرتی رہے گی۔

"کیا میں نے پہونچا دیا ؟؟"

اور انسانوں کی دنیا کی ہر شئے سر جھکائے گواہی دیتی رہے گی کہ :

"اے اللہ، ہاں!"

"اے اللہ، ہاں!"

بچّوں کا ادب

بچّوں کی صحیح تعلیم و تربیت، اچھے اخلاق و سیرت کے لیے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔

ہمارے حضور — خواجہ عابد نظامی
بچّوں کے لیے سیرت کے موضوع پر پہلی ایوارڈ یافتہ کتاب

یاران نبی — خواجہ عابد نظامی
حضورؐ کے چاروں قریبی ساتھی ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علی رضی اللہ عنہم پر ایک مختصر مگر جامع کتاب

مسلمات — ڈاکٹر محمد فاروق قادری
جس میں ازواج مطہرات، بنات اور صحابیات کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔

ہمارے بزرگ — مائل خیرآبادی (دو حصوں میں)
جس میں ائمہ اربعہ اور بزرگان دین کے حالات لکھے گئے ہیں۔

دانا حکیم — مائل خیرآبادی
خوبصورت واقعات کا عمدہ مجموعہ

فیصلے — مائل خیرآبادی
تاریخ اسلام کے اہم فیصلے، ایک معلوماتی کتاب

قوموں کی کہانیاں — سید نظر زیدی
دنیا بھر کی مشہور قوموں کے حالات

عرب کی کہانیاں — پروفیسر خالد بزمی
عربی میں بچّوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کا اُردو ترجمہ

میٹھی میٹھی کہانیاں — عابد نظامی
بچّوں کے مشہور ادیب کے قلم سے مزیدار کہانیوں کا مجموعہ

ڈاکٹر فارانی — سید نظر زیدی
بچوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز کہانی

ناشر

مکتبہ تعمیر انسانیت ○ اُردو بازار ○ لاہور ۲

سیرت النبی ﷺ پر چند بہترین کتابیں

- **سیرت النبی** — شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی شاہکار تالیف چھ جلدوں پر مشتمل
- **محسن اعداء** — حضور کا دشمنوں کے ساتھ سلوک کہ اپنے موضوع کی واحد کتاب
- **سیرت المختار** — مصر کے ممتاز عالم شیخ مصطفیٰ الغلایینی کی مختصر مگر جامع کتاب
- **سید البشر** — رحمت للعالمین جیسی شہرت یافتہ تصنیف کے مصنف کے قلم سے
- **رسول اور سنت رسول** — قرآن اور عقل کی روشنی میں نعیم صدیقی کی شاندار تالیف
- **محسن اعظم اور محسنین** — حضور کی حیات طیبہ ایک نئے رنگ اور نئے انداز میں
- **حیات رسول** — ریڈیو، ٹی وی اور دیگر معلوماتی مقابلوں کے لیے سوالاً جواباً
- **عرب کا چاند** — سیرت النبی پر ایک ہندو نوجوان کی دلی پیشکش
- **سنت نبوی** — حدیث نبوی کے متعلق ضروری و مستند معلومات پر مشتمل پمفلٹ
- **ارشاد رسول** — رسول رحمت کے ارشادات کا خوبصورت پاکٹ سائز مجموعہ
- **قول رسول** — چمنستان سنت سے چنے ہوئے چند پھولوں کا گلدستہ
- **جوامع الکلم** — حضور کے ارشادات کا مجموعہ، حروف تہجی کے اعتبار سے